بی۔اے : سال دوم(سیمسٹر ۔ ۳)

اردواختیاری: پرچہ۔۲

(اردوغزل)

S. Y. B. A. (Semister - III)

Urdu Ancillary : Paper II

(Urdu Ghazal)

Subject Code : UAURD301

پروفیسر سہاس پیڈنیکر

وائس چانسلر

یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر رویندر کلکرنی

پرو۔وائس چانسلر

یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر پرکاش مہانور

ڈائرکٹر

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)،یونیورسٹی آف ممبئی

پروگرام کوآرڈینٹر : **ڈاکٹر انل بنکر**

صدر، فیکلٹی آف ہیومینیٹیز

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)

یونیورسٹی آف ممبئی

کورس رابطہ کار و مدیر : **ڈاکٹر معزہ (قاضی) دلوی**

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)

یونیورسٹی آف ممبئی

مضمون نگار :

ڈاکٹر ماجد قاضی **(اکائی:1)**

اسوسی ایٹ پروفیسر،

صدر، شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج ممبئی

ڈاکٹر ریاض احمد **(اکائی:2)**

اسوسی ایٹ پروفیسر،

پرنسپل، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، میوات، ہریانہ

پروفیسر مسرت فردوس **(اکائی: 3)**

سابق صدر، شعبۂ اردو

باباصاحب امبیڈکر یونیورسٹی، اورنگ آباد

ڈاکٹر بدر سلطانہ **(اکائی:4)**

شعبۂ اردو،

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

جنوری 2021، طباعت۔I

پبلشر : ڈائرکٹر،

فاصلاتی تعلیمی ادارہ(IDOL)، یونیورسٹی آف ممبئی

ماہر طباعت و ٹائپسٹ : جناب عبدالمنان فہیم احمد شیخ

پرنٹر : ممبئی یونیورسٹی پریس

نمونۂ امتحانی سوالیہ پرچہ

کل نمبرات: ۱۰۰ وقت: ۳ گھنٹے

تمام سوالات لازمی ہیں۔

ہر سوال بیس (۲۰) نمبر کا ہوگا۔

سوال نمبر ۱: اکائی۔۱ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۲: اکائی۔۲ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۳: اکائی۔۳ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۴: اکائی۔۴ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۵: فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کی غزلوں میں سے دیے گئے دس اشعار میں سے کوئی پانچ اشعار کی تشریح شاعر کے نام کے ساتھ کرنی ہوگی۔

نصاب

(حصہ اول)

اکائی 1: اردو غزل نگاری کا فن

اکائی 2: اردو غزل کا آغاز وارتقا

اکائی 3: فانی بدایونی

۱۔ عہد

۲۔ حیات وشخصیت

۳۔ ادبی خدمات

۴۔ غزل گوئی کی خصوصیات

اکائی 4: اصغر گونڈوی

۱۔ عہد

۲۔ حیات وشخصیت

۳۔ ادبی خدمات

۴۔ غزل گوئی کی کی خصوصیات

کتابیات:

۱۔اردو غزل از ڈاکٹر یوسف حسین خان

۲۔غزل اور مطالعہ غزل از عبادت بریلوی

اکائی:1۔ غزل کا فن

ساخت:

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 اردو غزل۔معنی ومفہوم

1.4 غزل کی بنیادی اصطلاحات

1.5 غزل کی خصوصیات

1.6 تفہیمِ شعر

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

ایس وائی بی اے میں اردو زبان وادب کو بطور اختیاری مضمون پڑھنے والے طلبہ کو 'پیپر اا' کی پہلی اکائی میں اردو کی دو شعری اصناف یعنی 'غزل' اور 'نظم' کے فنی لوازمات اور آغاز وارتقا سے واقف کرایا جائے گا۔ اس پرچے میں انھیں دونوں اصناف کے دو دو شعرا اور اُن کا منتخب کلام بھی پڑھنا ہے۔ 'غزل کا فن' کی تدریس کے ذریعے درج ذیل اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں:

ا۔ طلبہ کو اردو شاعری کی اہم صنف 'غزل' کے مبادیات اور عناصرِ ترکیبی سے روشناس کرانا۔

۲۔ 'غزل' سے متعلق تمام اصطلاحات کو مثالوں کے ساتھ اس طرح واضح کرنا کہ طلبہ دیگر اصنافِ سخن سے اس کا موازنہ کرسکیں۔

۳۔ ’غزل‘ کی مقبولیت کے اسباب سے طلبہ کو واقف کرانا۔

۴۔ ’تفہیمِ شعر‘ میں طلبہ کی مدد کرنا۔

1.2 تمہید

دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو میں بھی تخلیقِ ادب کا آغاز شاعری سے ہوا۔ چوں کہ اردو نے اپنی تحریر کے لیے ’فارسی‘ رسمِ خط اپنایا تھا اور اس زبان کے ابتدائی شعرا نہ صرف فارسی زبان سے واقف تھے بلکہ اسی کے واسطے سے اپنی شعری و نثری تخلیقات پیش کر رہے تھے، اس لیے جب زبانِ اردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو لامحالہ فارسی کی شعری اصناف کو اپنی تمام روایتوں کے ساتھ اردو میں جگہ ملی۔ اردو میں قدیم اصنافِ سخن کا داخلہ فارسی کے راستے سے ہوا۔ چناں چہ دورِ اوّل کے شعرا نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قطعات وغیرہ میں فارسی کا تتبّع کیا۔ تاریخِ زبانِ اردو میں اکثر امیر خسروؔ کو اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے اور اُن کے فارسی آمیز اردو کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو میں صنفِ غزل ہی کو سب سے پہلے طبع آزمائی کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس بنیاد پر اردو میں غزل کو قدیم ترین شعری صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔

1.3 غزل۔ معنی و مفہوم

غزل اردو شاعری کی مقبولِ عام صنف ہے۔ اسے اپنی ظاہری و باطنی خصوصیات کی بنا پر دیگر تمام اصناف میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ اردو شاعری کے آغاز سے آج تک اُس کی ہر دل عزیزی قائم ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اُسے اردو شاعری کی آبرو کہہ کر ایک غیر معمولی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بنیادی طور پر غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات کا بیان ہوتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کے مختلف رنگ روپ ہوتے ہیں اور شدّت و حدّت کے مختلف درجات بھی۔ غزل کی ہیئت میں اِن سب کو شائستگی کے ساتھ ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ غزل کی مخصوص لفظیات اور علامات و اشارے، شاعر کو کم الفاظ میں طویل مضامین ادا کرنے کی قدرت عطا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دو مصرعوں پر مشتمل ایک شعر میں خیالات و احساسات کی وہ دنیا آباد ہوتی ہے جس کی تفصیل میں کئی صفحات سیاہ کیے جائیں تب بھی کیفیت اور تاثیر کی فضا اور وہ لطف پیدا نہیں ہوتا جو قاری کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ دنیائے ادب میں غزل اپنی مثال آپ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی اِس صنفِ سخن نے دوسری زبانوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ ظاہری طور پر یہ کم سے کم پانچ اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے، جس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے یعنی

شاعر اپنی بات اسی ایک شعر میں مکمل کر لیتا ہے۔غزل کے اشعار میں تسلسلِ بیان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔غزل کے لفظی معنی ''عورتوں سے بات چیت'' یا ''عورتوں سے متعلق بات چیت'' بیان کیے جاتے ہیں۔ابتدا میں حُسن وعشق کو اس کا مرکزی موضوع خیال کیا جاتا تھا۔لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ غزل نے ساری کائنات کے مادی و ماورائی موضوعات وتخیلات کو بڑی فراخ دلی سے قبول کر لیا ہے اور انھیں بڑی کامیابی سے برتا ہے۔'غزل' عربی لفظ ہے لیکن اِس صنف کی بنیاد ایران میں پڑی۔عرب میں قصیدے کی تشبیب میں حسن وعشق کے مضامین اِسی ہیئت میں نظم کیے جاتے تھے، البتّہ وہاں ردیف نہیں ہوتی تھی۔ان اشعار کو ''نسیب'' کہا جاتا تھا۔فارسی شاعر 'رودکیؔ' نے پہلی مرتبہ ان مضامین کو ایک منفرد صنف کی حیثیت سے پیش کیا اور اس طرح 'غزل' کی بنیاد پڑی۔آگے چل کر اس میں ردیف کی جھانجھن کا اضافہ ہوا جس نے اس کے حسن اور وسعتِ بیان میں اضافہ کیا۔

1.4 غزل کی بنیادی اصطلاحات

غزل کی فنی وصنفی تشکیل کو سمجھنے کے لیے چند بنیادی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے:

مطلع:

'مطلع' کے لغوی معنی ''طلوع ہونے کی جگہ'' ہیں۔اصطلاح میں غزل کے اُس پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے جس کے دونوں مصرعوں میں قافیے اور ردیف موجود ہوں۔بعض غزلوں میں ردیف موجود نہیں ہوتی، کیوں کہ ردیف شعر کی بنیادی شرط نہیں ہے اس لیے ایسی غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیوں کا پایا جانا کافی ہے۔مطلعے میں غزل کی 'زمین' کا اعلان ہوتا ہے یعنی اسے دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ غزل کی بحر کون سی ہے اور اس کے قوافی کیا ہیں۔مطلع شان دار وجان دار ہو تو ایک سازگار فضا قائم ہوتی ہے اور شاعر قارئین وسامعین کی توجّہ مبذول کرانے میں کام یاب ہوتا ہے۔اسی لیے اکثر شعرا مطلعوں پر بڑی محنت کیا کرتے تھے۔اپنی غزل کے لیے کئی مطلع کہتے تھے اور جو زیادہ جان دار ہوتا تھا اسے باقی رکھتے تھے۔مطلعے کی مثال ملاحظہ ہو:

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی　　(غالبؔ)

بے زباں ہے باغ میں سوسن　　اِس چمن میں کسے مجالِ سخن　　(میر دردؔ)

غالبؔ کے مطلعے میں ''کرے کوئی'' ردیف استعمال ہوئی ہے جو دونوں مصرعوں میں موجود ہے۔اس سے پہلے کے ہم آواز الفاظ 'ہُوا' اور 'دوا' قافیے ہیں۔میر دردؔ کے مطلعے میں ردیف نہیں ہے، 'سوسن' اور 'سخن' قافیے ہیں۔

حُسنِ مطلع:

اگر شاعر مطلعِ اوّل کے بعد مطلعِ ثانی کہتا ہے تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ غزل میں شاعر کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ مطلع نظم کرے۔ شاعر کے لیے یہ ایک طرح کا چیلنج ہوتا ہے۔ اچھے مطلعے کہنا قادرالکلامی کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور بعض شاعروں نے چار چار پانچ پانچ مطلعے کہہ کر اپنی فنی وفکری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ بطورِ خاص آتشؔ لکھنوی، جگرؔ مرادآبادی اور عامرؔ عثمانی وغیرہ کے ہاں اِس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ میر دردؔ اور آتشؔ لکھنوی کی غزل سے حسنِ مطلع کی مثالیں دیکھیے:

جذبۂ دل سے کمالِ کُہرُبا ہو جائے گا — سبزۂ بیگانہ اپنا آشنا ہو جائے گا

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہو جائے گا — بھیک کا کاسہ اُسے دستِ دعا ہو جائے گا

تیرے کُشتوں سے جو صورت آشنا ہوجائے گا — زندگی سے دم مسیحا کا خفا ہوجائے گا

خواجہ حیدر علی آتشؔ

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تری حرف دوئی کا نہ آسکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قافیہ :

قافیہ شعر کی اساس ہے۔ یہ ایک لازمی شرط ہے جس کے بغیر شعر کا تصوّر ممکن نہیں۔ قافیے کی بنیاد آواز پر ہے لیکن حروف اور تلفُّظ کی اہمیت بھی مُسلَّم ہوتی ہے۔ ہم آواز الفاظ ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قافیے کا مقام شعر کے دوسرے مصرعے میں ردیف سے پہلے ہوتا ہے۔ اگر غزل میں ردیف موجود نہ ہو تو ہر شعر کا آخری لفظ قافیہ ہوتا ہے۔ مطلع اور حُسنِ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیے ہوتے ہیں۔ اردو میں ''ث، س اور ص''، ''ت اور ط''، ''ذ، ز، ض اور ظ'' وغیرہ کو اگرچہ عربی مخارج سے ادا نہیں کیا جاتا لیکن قافیے کے باب میں انھیں الگ آوازیں مان لیا گیا ہے۔ اسی لیے 'ثبات' کا قافیہ 'بساط' یا 'لفظ' کا قافیہ 'قرض' نہیں ہوسکتا۔ (حالیؔ نے 'جہاز' کا قافیہ 'شاذ' باندھ کر اردو والوں کو کچھ آزادی دلانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن روایت پسندوں نے اسے قبول نہیں کیا۔) اسی طرح قافیے میں لفظ کے صحیح تلفُّظ کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے مثلاً صحیح تلفُّظ 'مَ رَض' اور 'غَ رَض' ہے تو اب یہ دونوں الفاظ 'قرض' اور 'فرض' کا قافیہ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح 'ایک' اور 'نیک' تو ہم قافیہ ہیں لیکن 'چھینک' یا 'سینک' اِن کے قافیے نہیں ہو سکتے ہاں بعد کے دونوں الفاظ باہم قافیے ہیں۔ مطلع یا حسنِ مطلع کے بعد غزل کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیہ ہونا ضروری ہے۔ اور اگر غزل میں ردیف موجود ہو تو وہ بھی دوسرے مصرعے ہی میں قافیے کے بعد جلوہ گر ہوگی۔ میر دردؔ کی غزل سے قوافی کی مثالیں دیکھیے:

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا　　برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا　　(مطلع)
اذیّت ، مصیبت ، ملامت ، بلائیں　　ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا　　(شعر)

اِن دونوں اشعار میں 'فرما'، 'دیکھا' اور 'کیا' قافیے ہیں۔

ردیف :

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے ردیف شعر کی بنیادی شرط نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر بھی شعر مکمل ہوتا ہے۔ اسے ایرانیوں نے غزل کا حسن بڑھانے اور کسی حد تک مختلف موضوعات میں ایک مشترک مرکزی تصوّر پیدا کرنے کی غرض سے ایجاد کیا ہے۔ ردیف سے بیان کی وسعت اور حسن و امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ شعر کی موسیقیت اور ترنّم میں اضافے کا سبب بھی بنتی ہے اور تجربہ بتاتا ہے کے دو لفظوں کی تکرار سے معنی کے نئے جہاں پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے اونٹ کی سواری پر پیچھے بیٹھنے والا شخص 'ردیف' کہلاتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں وہ لفظ یا الفاظ جو شعر میں قافیے کے بعد آئیں ردیف کہلاتے ہیں۔ مطلع اور حسنِ مطلع کے دونوں مصرعوں میں ردیف ہوتی ہے اور بقیہ اشعار کے مصرعِ ثانی میں۔ مثلاً آتش لکھنوی کے یہ اشعار دیکھیے، اِس غزل کی ردیف 'کا' ہے:

حَباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا　　نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی جدائی کا
اسیرِ اَے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں　　گرفتار آہنی زنجیر کا یہ ، وہ طلائی کا
تعلق روح سے مجھ کو جسد کا نا گوارا ہے　　زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

بحر اور وزن:

شاعری کے لیے بحر اور وزن کا ہونا ضروری ہے۔ ہر شعر کسی خاص بحر اور وزن پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔ اساتذۂ فن نے بحر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

''بحر دراصل اُن چند موزوں کلموں کا نام ہے جن پر شعر کا وزن ٹھیک کرتے ہیں۔''

بحر کی وجہ سے شعر میں موسیقی اور ترنّم پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں چھے مفرِد سالم بحریں استعمال ہوتی ہیں۔ مرکب بحروں اور ان سے حاصل ہونے والے زحافات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ 'وزن' دراصل دو کلموں کی حرکات و سکنات کو برابر کرنے کا نام ہے۔ حرکتیں مختلف ہوتی ہیں جیسے 'احسان' اور 'صندوق' بالکل مختلف الفاظ معلوم ہوتے ہیں اور ہم قافیہ بھی نہیں، لیکن ان کا وزن ایک ہے۔ (اِح۔سا۔ن اور صَن۔دو۔ق)

مذکورہ بالا ظاہری خد و خال کے علاوہ غزل کا ایک داخلی استعاراتی نظام بھی ہے۔ اِس کی مخصوص علامتیں، معروف تلمیحات اور روایتی موضوعات ایک مسحور کن فضا تیار کرتے ہیں۔ فنی و تکنیکی تقاضوں کو پورا کرنے سے غزل کی ظاہری شکل

بنتی ہے جس کی بنیاد پر دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں اس کی شناخت قائم ہوتی ہے لیکن اس کا حقیقی حسن اس کی داخلی خصوصیات میں مضمر ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اس کے دو مصرعوں میں شاعر جہانِ معنی سمو دیتا ہے۔ ہر شعر کا موضوع دوسرے سے الگ ہو سکتا ہے اور دونوں میں کوئی ربط و تسلسل کی ضرورت بھی نہیں۔ اسی انفرادیت اور تنوّع میں غزل کا حسن قائم ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'غزل' کے لغوی و اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

۲۔ 'مطلع' اور 'حسنِ مطلع' کا فرق واضح کیجیے۔

۳۔ شعر میں 'قافیہ' کیوں سب سے اہم جزو ہے؟

۴۔ 'ردیف' کسے کہتے ہیں؟

۵۔ غزل میں بحر اور وزن کی اہمیت واضح کیجیے۔

1.5 غزل کی خصوصیات

چند اہم عنوانات کے تحت غزل کی خصوصیات کا ذکر کیا جا سکتا ہے:

تغزل :

واقعاتِ عشق کا پُرخلوص اور مؤثر بیان تغزل کہلاتا ہے۔ اسے غزل کا قدیم ترین موضوع کہہ سکتے ہیں۔ اِس صنف کی ابتدا ہی حسن و عشق کے موضوعات سے ہوئی تھی اِس لیے آج بھی اِن موضوعات کو پُرکیف انداز میں برتنے، راز و نیاز کی باتیں کرنے اور جذبات کی ترجمانی کرنے میں شاعر ایک خاص لطف محسوس کرتا ہے۔ ایسے اشعار احساسِ جمال پیدا کرتے ہیں اور دورِ آغاز سے آج تک غزل کی مقبولیت کا اہم سبب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عام قاری اور غیر اردو داں طبقہ شاعری میں محبوب کے حُسن اور ناز و ادا کے بیان ہی کو غزل سمجھتا ہے۔ غزل کی تاریخ کے ہر عہد میں شعرا نے تغزل کے مضامین باندھے ہیں۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا والہانہ انداز ہو، میر تقی میرؔ کا سوزِ دروں ہو، غالبؔ کی شوخی ہو، داغؔ اور حسرتؔ و جگرؔ کے معرکۂ عشق ہوں یا اقبالؔ کی منفرد بے باکی، ہر جگہ تغزل یعنی خالص غزل کا مزاج، کیف و سرور کی فضا پیدا کرتا ہے۔ وارداتِ عشق کے بیان میں لکھنوی شعرا نے خاصی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

انھوں نے محبوب کے زلف و رخسار اور قامت و رفتار کے ذکر سے آگے بڑھ کر معاملہ بندی کے مضامین نظم کرنے میں بھی خاصی آزادی برتی ہے لیکن تغزل کی بنیادی شرط شائستگی ہے۔اس موضوع کے تحت انھیں اشعار کو قبولِ عام حاصل ہوتا ہے جو مہذّب معاشرے میں پڑھے اور سنائے جاسکتے ہوں۔

موضوعات کا تنوّع :

غزل ایک ہیئتی صنف ہے یعنی اس کی شناخت ظاہری ہیئت سے قائم ہوتی ہے، اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔معاملاتِ عشق، حسن کا جادو اور فتنہ گری، یاس و حرماں نصیبی، دنیا کی بے ثباتی، محبوب کی ستم ظریفی، دوستوں کے گلے شکوے، دردِ دل اور دردِ جگر کی شدّت، خمریات، وفائے جفا نما کے قصّے، آس اور امیّدیں، انتظار کے جان لیوا لمحات، زندگی کے رنگا رنگ فلسفے، تصوّف اور عشقِ حقیقی کے پیچیدہ مسائل، تاریخِ انسانی اور ادبی و تہذیبی ورثے، تلمیحات، پند و نصائح اور آلائشِ دنیا کی مذمّت،، احساسِ محرومی، سیاسی بصیرت، جذبات و احساسات اور تصوّرات و تخیلات کی وادیاں، غرض کائنات اور ماورائے کائنات کے ہر موضوع کو سلیقے سے برتنے کی گنجائش غزل میں موجود ہے۔اردو غزل نے اپنے تدریجی ارتقا میں ہر عہد کے فکر و فلسفے اور طرزِ زندگی کی عکاسی کی ہے اگر چہ ہمارے شعرا نے روایتی مضامین زیادہ باندھے ہیں اور فارسی کی تقلید کو ایک زمانے تک قابلِ فخر سمجھا جاتا رہا۔اس کے باوجود جیسے جیسے سیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں اور علوم و فنون کے نئے دروازے کھلتے گئے، سائنسی و تکنیکی ترقّی نے طرزِ زندگی کو تبدیل کرنا شروع کیا اور ترجیحات کی نئی فہرست تیار ہونے لگی، غزل نے بھی اپنے مزاج کو بدلا۔اس کے شان دار استعاراتی و علاماتی نظام نے اسے ہر دور میں سنبھالے رکھا۔حالؔی کے اندیشوں اور کلیم الدین کی جارحیت نے اسے نقصان پہنچانے کی بجائے اِس میں نکھار پیدا کیا اور یہی دراصل اس نازک اور فراخ دل صنف کی کام یابی کا راز ہے۔

ایجاز و اختصار :

غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہے۔صرف دو مصرعوں میں مضمون کو اس طرح سمیٹنا کہ اُس کا حق ادا ہو جائے، یقیناً کارِ دشوار ہے۔ایسی مثالیں عام ہیں جن میں صرف ایک شعر کی تشریح کے لیے دس بیس گنا زیادہ الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ ایسے اشعار بھی کم یاب نہیں جن کی شرح میں صفحات صَرف ہوتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کی ترجمانی ہوئی ہے، احساس کی ترسیل نہیں ہوسکی ہے۔ایجاز و اختصار کا یہی وصف ہے جس نے غزل کے اشعار کو روزمرّہ گفتگو میں جگہ دی ہے اور ہم صرف ایک شعر سنا کر صورتِ حال کا مکمل احاطہ کر لیتے ہیں۔اگر مرزا غالبؔ یہ کہتے ہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہے
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تو اِس ایک شعر سے غالبؔ کے عہد کی دشواریوں اور خود اُن کی زندگی کے مصائب کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد جد و جہد اور مقابلہ آرائی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے گویا مصائب اور عملی دشواریوں کو قبول کرنے اور اُن کا حل تلاش کرنے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت ہے، غالبؔ کا یہ شعر ہمیں وہ حوصلہ بھی فراہم کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ مختلف پس منظر میں انھیں پڑھا جا سکتا ہے اور پس منظر کی تبدیلی کے باوجود یہ برمحل معلوم ہوں گے:

تری انجمن میں ظالم عجب اہتمام دیکھا　　کہیں زندگی کی بارش کہیں قتلِ عام دیکھا

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دروں بینی اور داخلیت :

غزل داخلی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اِس میں شاعر اپنے داخلی احساسات اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کی آپ بیتی، جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اُس کیفیت یا تجربے سے گزرنے والے ہر فرد کو شاعر کا کلام اپنے دل کا ترجمان معلوم ہونے لگتا ہے۔ فطری طور پر انسان دوسروں کی خوشی کے مقابلے میں ان کے دکھ درد اور مصائب میں آسانی سے شریک ہوتا ہے اور اپنے ہم نفسوں کے غموں کا احساس اُسے وقتی طور پر سہی، خود اپنی خوشی کے اظہار سے روک دیتا ہے۔ غزل کی مقبولیت کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ شاعروں نے مستی و سرشاری سے زیادہ 'غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں' کے مضامین نظم کیے ہیں۔ غزل میں ایسے تجربات و مشاہدات کو زیادہ جگہ ملی ہے جو اپنی محرومی، دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی بے ثباتی اور وقت کے جبر کی داستان سناتے ہیں، جن کے سامنے انسان مجبورِ محض ہے۔ جب مظلوم و مجبور اپنی بے بسی، ناطاقتی اور حسرت و یاس کا شکوہ کرتا ہے تو دل خود بخود اس سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ اگر اس بیان میں خلوص، بے ریائی اور سلیقہ ہو تو غمِ ذات، غمِ کائنات بن جاتا ہے اور شعر آفاقی سچائی کا مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ یا ناصرؔ کاظمی وغیرہ کی خود کلامی، سرگوشی کا روپ اختیار کرکے ہمارے دماغ تک پہنچتی ہے اور ہمارا ذہن شعر کی تکرار کرنے لگتا ہے ۔خواجہ میر دردؔ کی کئی غزلیں دروں بینی اور خود کلامی کے بہترین نمونے پیش کرتی ہیں:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا　　کہ نہ ہنسنے پہ رو دیا گا

دیکھیے اب کے غم سے جی میرا نہ بچے گا، بچے گا، کیا ہوگا

حال مجھ غم زدہ کا جس تس نے جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

ہمارے اپنے عہد کے شعرا نے بھی جذب و سرور کے بہترین لمحوں میں ایسے اشعار کہے ہیں جو پڑھنے سننے والوں پر عجیب کیفیت طاری کرتے ہیں مثلاً:

میں روز اُدھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے　　میں جب اُدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا　　یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

یہ درد مرے سر کا جاتا ہی نہیں مُرشد　　الفاظ تو دَم کیجے دو چار محبت کے

اپنے عہد کی ترجمانی :

غزل نے صرف غمِ ذات کو غمِ کائنات نہیں بنایا بلکہ اُس نے ہر دور میں اپنے معاشرتی واخلاقی اقدار اور سماج کے قابلِ قبول رویوں کو پیش کیا ہے۔ اسی لیے یہ صنف کبھی قصّۂ پارینہ کہہ کر بھلائی نہ جاسکی۔ اردو میں قصیدہ، مرثیہ اور داستانوں کو نظم کرنے والی مثنویوں کا چلن تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اب ان اصناف کے بہترین نمونوں کو صرف قدما کے کلام میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان اصناف کی پیروی نہ کرتے ہوئے، غزل نے ماضی کی شان دار روایتوں سے استفادہ کرتے ہوئے نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے ہر عہد کے موضوعات، لفظیات اور تیور کو اپنا تے ہوئے اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔ اس نے ہر دور میں داخلی کرب وانتشار کے اظہار کے لیے نئے پیرائے استعمال کیے اور اسی لیے کام یاب بھی رہی۔ ہمارے دور کا شاعر کہتا ہے:

گھر آ کے بہت روئے ماں باپ اکیلے میں
مٹی کے کھلونے بھی سستے نہ تھے میلے میں

۔۔تو ظاہر ہے وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے یا جب ہماری نظر سے یہ شعر گزرتا ہے:

گلی کے سارے کتّے بھونک اُٹھّے میرے قاتل پر　　پڑوسی ہو کے بھی اَے ابنِ آدم تم نہیں آئے

۔۔تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس میں غزل کی روایتی نزاکت موجود نہیں ہے اِس لیے اسے غزل کا شعر نہ کہا جائے۔ دراصل غزل کا داخلی استعاراتی نظام اِتنا مضبوط اور لچک دار ہے کہ ہر دور کے بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی حالات، ادبی وتہذیبی تصوّرات، فرد وسماج کے رشتوں اور کشمکش اور معاشرتی واخلاقی اقدار کے بدلتے ہوئے روپ سروپ کو پیش کرنے میں کوئی فنی وتکنیکی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ جن الفاظ میں محبوب کی ستم گری اور اپنی کم نصیبی کا گلہ کیا تھا، ان ہی الفاظ میں امریکہ کی جارحیت اور بلادِ اسلامیہ کے انتشار وافتراق کو فن کاری سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اگر میرؔ ومرزاؔ نے دلی کی زبوں حالی اور دل کی خستگی کا احوال بیان کیا تھا تو تحریک آزادی کا علم بردار سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے، کہہ کر بازوئے قاتل کو للکارتا ہے اور دونوں جگہ غزل سرخ رو ہوتی ہے۔ کہیں دورِ حاضر کا المیہ غزل کا یہ شعر میں یوں بیان ہوتا ہے:

خون اِس دورِ گرانی میں بھی سستا ہے بہت　　رات پھر گانو میں اک قتل ہوا پانی پر

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'تغزل' کسے کہتے ہیں؟

۲۔ اردو غزل کے عام موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ غزل کو داخلی شاعری کا اعلیٰ نمونہ کیوں کہا جاتا ہے؟

۴۔ غزل کس طرح اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے؟

1.6 تفہیمِ شعر

اردو غزل کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے اسباب بے شمار ہیں۔ جو زبان کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں یا اشعار کی گہرائی میں نہیں اُتر سکتے، وہ بھی غزل کے ترنّم اور موسیقیت پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ جو صرف وقت گزاری اور تفنّنِ طبع کی خاطر شاعری پڑھتے یا سنتے ہیں، انھیں بھی نظموں یا دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل کا انتخاب کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور جو غور و فکر کے عادی ہیں اور لفظوں کے اِمکانات کی کچھ شد بدھ رکھتے ہیں، اُن کی تو پہلی پسند ہی غزل ہوتی ہے کیوں کہ اس کے ہر شعر میں ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے اور ہر شعر عقل و شعور کو بالیدہ کرسکتا ہے۔ غزل کے اشعار کی تشریح کرتے وقت لفظوں کے امکانات اور حُسنِ ترکیب پر نظر رکھنے کے ساتھ، شعر کے لہجے پر بھی غور کرنا چاہیے مثلاً مرزا غالبؔ کے معروف شعر:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

میں 'ہوا کرے' کے الفاظ قابلِ غور ہیں اگر ان کو صرف لہجہ بدل کر پڑھا جائے تو معنی کی ایک نئی جہت آشکار ہوتی ہے۔ اسی طرح میرؔ کے شعر:

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　　　تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں 'کاہے کو' پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ 'کاہے کو' سے مراد کیوں ہے، کیوں کر نہیں۔ ہم سایہ کیوں سوتا رہے گا سے مراد ہم سایہ کیوں غافل رہے گا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ میرؔ نے محاورہ 'سوتا رہنا' استعمال کیا ہے۔ اسی طرح پہلے مصرع میں 'روتا رہنا' بہ معنی لگاتار شکایت کرنا استعمال ہوا ہے۔ دونوں مصرعوں کو ملانے سے یہ مضمون برآمد ہوتا ہے کہ اگر میرؔ اتنے زور و شور سے لگاتار شکایت کرتا رہے گا تو ہم سایہ کیوں غفلت برتے گا، وہ ہوشیار ہوجائے گا، اسے بھی معاملے کو جاننے کا تجسُّس پیدا ہوگا اور میرؔ کا راز، راز نہیں رہے گا۔ مزید آگے بڑھ کر اگر آپ یہ فرض کریں کہ میرؔ کی شکایت خود ہم سایے کے خلاف ہے تو تشریح میں ایک نیا پہلو سامنے آئے گا کہ ہم سایہ بھی خاموش نہ رہتے ہوئے، جوابی کارروائی میں لگ

جائے گا۔ عربی کہاوت ' المعنی فی بطن الشّاعر' کے مطابق شعر کے معنی خود شاعر ہی کو معلوم ہوتے ہیں، لیکن ہم الفاظ میں موجود گنجائش کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں اور شعر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

شعر فہمی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی قرات کے بعد کچھ سوالات قائم کیے جائیں اور خود ہی ان کے جوابات دینے کی کوشش کریں۔ پہلے مرحلے میں تمام سوالات شعر کے 'متن' یعنی ظاہری الفاظ پر مبنی ہوں۔ اس کے بعد شعر کی روایتی فضا سے ہٹ کر کسی نئے پس منظر میں انھیں سوالات کے جواب تلاش کیے جائیں۔ مثلاً میرؔ کا یہ شعر دیکھیے:

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۱۔ شاعر کسے اپنے حالِ دل (حالات) سے واقف کرانا چاہتا ہے؟

جواب: گُل

۲۔ کیوں؟

جواب: وہ باغ میں سب سے اہم / مرکزی فرد ہے۔

۳۔ اس کا فائدہ کیا ہوگا؟

جواب: شاعر کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

۴۔ گُل کا رویہ کیا ہے؟

جواب: اُس نے بے رخی اختیار کی ہے، وہ ایسا بتا رہا ہے جیسے اسے شاعر کے مسائل کا بالکل علم نہیں۔

اب ان ہی سوالات کو اپنے ملک، کالج، دفتر یا کسی اور پس منظر میں رکھ کر دیکھیں۔

۵۔ ہمارے ملک میں سب سے اہم شخص کون ہے؟

جواب: وزیر اعظم

۶۔ آپ کے اسکول / کالج میں سب سے اہم شخص کون ہے؟

جواب: پرنسپل

تفہیمِ شعر کے لیے کئی باتیں ضروری ہوتی ہیں:

۱۔ پہلا اور سب سے اہم مرحلہ شعر کی قرأت کا ہے۔ ہم شعر کو بالکل صحیح پڑھیں۔ لفظ کے صحیح تلفّظ سے واقف ہونا ہے

حد ضروری ہے۔ ہر لفظ کا اپنا 'وزن' ہوتا ہے اور لفظ کو صحیح وزن پر پڑھنے ہی سے شعر میں روانی آتی ہے۔ صحیح تلفّظ نہ جاننے کی صورت میں شعر بے لطف ہو جاتا ہے۔ 'غَرَض' کو 'غرْض' پڑھنے سے شعر لنگڑا ہو جاتا اور لطف کھو دیتا ہے۔ بعض اوقات تراکیب میں زیرِ اضافت لکھنے میں تساہلی برتی جاتی ہے۔ مثلاً اگر 'صاحبِ دل' میں زیر نہیں لکھا گیا ہے تو طالبِ علم اسے 'صاحب دل' پڑھنے کی غلطی کر جاتے ہیں۔ 'دلِ مجروح' کو 'دل مجروح' پڑھنے سے نہ صرف شعر کا حُسن غارت ہو جاتا ہے بلکہ معنی کے سمجھنے میں بھی دقّت پیش آتی ہے۔

۲۔ لفظ اور استعارے کے فرق کو سمجھیں۔ 'مور' صرف ایک لفظ ہے جب کہ 'بلبل' ایک استعارہ ہے۔ شعر کے ہر اسم پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا اس میں استعارہ بننے کا امکان موجود ہے۔ چمن، صیّاد، قفس، گُل، کلی، شمع، پروانہ، بہار، خزاں وغیرہ تو معروف استعارے ہیں لیکن نئے دور کا شاعر شاعر دفتر، قلم، کاغذ اور سیاہی جیسے الفاظ کو بھی استعاروں کی طرح برت سکتا ہے۔ الفاظ کے حسنِ استعمال سے شعر کی فضا بنتی ہے اور انھیں پر غور کرنے سے معنی کی تہیں کھلنے لگتی ہیں۔

۳۔ استعاروں اور علامات کی طرح 'تلمیحات' سے واقف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ شعر میں موجود کوئی ایک لفظ ہم کو ماضی یا حال کے کسی مشہور و معروف پس منظر میں پہنچا دیتا ہے۔ کسی تاریخی واقعے کی معنویت اُجاگر کرنے کے لیے یا موجودہ حالات کی ناموافقت یا شدّت کو واضح کرنے کے لیے شاعر تلمیحی اشاروں سے کام لیتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی سابقہ معلومات کے سہارے، کم الفاظ میں، شاعر اپنے خیال کی ترسیل میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ اردو غزل میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ابراہیم و آزر، نمرود، موسیٰ و فرعون، ابنِ مریم، منصور حلّاج وغیرہ کی تلمیحات ہزاروں اشعار میں استعمال ہوئی ہیں۔ اگر قاری واقعے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے تو شعر کے معنی بہت آسانی سے کھلتے ہیں۔

۴۔ شعر کے ظاہری و معنوی حسن کو بڑھانے کے لیے شعر میں تجانیس اور صنائع کا استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کی ضروری معلومات قاری کو تفہیمِ شعر کے ساتھ تحسینِ شعر میں مدد کرتی ہے۔ طلبہ کو تجانیس اور صنائعِ لفظی و معنوی سے واقف کرانے کا عمل، ثانوی جماعتوں کی درسی کتابوں سے شروع کیا جاتا ہے۔ اگر انھیں تمام نام اور اصطلاحات یاد نہ رہیں بلکہ اُن کا صرف شعور ہو، تب بھی بہت جلد وہ معنی کی گہرائی یا شعر کے حسن تک پہنچ سکتے ہیں۔

۵۔ بعض اوقات شاعر کے حالاتِ زندگی، اس کی ادبی و نظریاتی وابستگی یا اُس کے عہد کے عمومی رجحانات وغیرہ کا مطالعہ بھی تفہیمِ شعر میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ عام کلیہ نہیں ہے اور کسی شعر کو صرف شاعر کی شخصیت یا اس کے عہد تک محدود کرنا مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن جہاں شاعر کی اپنی شخصیت ہی 'موضوعِ شعر' ہوتی ہے وہاں اس

معلومات سے فیض اُٹھانا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثلاً حسرت کا شعر ہے:

مشقِ سخن جاری چکی کی مشقّت بھی　　　اک طُرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

1.7 خلاصہ

اردو غزل نے ہر عہد میں اپنی دل کشی و دل آویزی برقرار رکھی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اشعار میں جذبات واحساسات کا ہر پہلو نظم کیا جاسکتا ہے اور اس میں اپنے عہد کی ترجمانی کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ بنیادی طور پر غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کا بیان ہوتا ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ ہر شعر کا موضوع دوسرے سے الگ ہوسکتا ہے اور دونوں میں کوئی ربط و تسلسل کی ضرورت بھی نہیں۔ اِس میں شاعر اپنے داخلی احساسات اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کی آپ بیتی ، جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ مطلع ،حُسنِ مطلع ، قافیہ، ردیف ، بحر اور وزن غزل کی بنیادی اصطلاحات ہیں۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

(ا)　درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

’غزل‘ میں موضوعات کا تنوّع ،کس طرح کارآمد ثابت ہوا ہے؟

’شعرفہمی‘ کے اہم تقاضے کیا ہیں، اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

شعر کے دومصرعوں میں کس طرح مضمون مکمل کیا جاتا ہے، مثالوں کے ساتھ بتائیے۔

(ب)　درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

’غزل‘ کے اجزائے ترکیبی کو مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

’غزل‘ کے اہم موضوعات سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

اشعار میں ’ایجاز واختصار‘ سے کیا مراد ہے؟

1.9 فرہنگ

قادرالکلامی	کلام/بات پر قدرت رکھنا
موثر	اثر کرنے والا
تنوع	قسم قسم کا
ایجاز واختصار	کم کرنا، خلاصہ، گھٹانا
داخلیت	اندرونیت
قصۂ پارینہ	پرانا قصہ
تفنن طبع	تفریحی مشغلہ، ہنسی، دل لگی
ماورا	بجز، سوا، اس کے علاوہ

1.10 معاون کتابیں

۔ اردو غزل از ڈاکٹر یوسف حسین خان

۲۔ غزل اور مطالعہ غزل از عبادت بریلوی

☆☆☆

اکائی: 2۔ اردو غزل کا آغاز وارتقا

ساخت:

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 اردو غزل کی ابتدا

2.4 دور متوسط کی اردو غزل

2.5 جدید اردو غزل

4.6 دور حاضر کی اردو غزل

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

دنیا کی ہر زبان میں شاعری انسانی جذبات وخیالات اور احساسات کا بہترین وسیلہ ہے۔ حالاں کہ انسان اپنے احساس وجذبات، خیالات ونظریات کا اظہار نثر میں بھی کرتا ہے لیکن نظم ایک مؤثر ترین وسیلہ ہے۔ انسانی احساسات، جذبات، خیالات ونظریات اور کیفیات کو کم سے کم الفاظ میں ایک مخصوص قرینے سے بیان کرنے کا نام نظم ہے اور اس میں وزن، بحر کے اہتمام کے ساتھ ساتھ نغمگی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اردو نظم میں سب سے مشہور صنف سخن غزل ہے۔ اس میں ردیف، قافیہ، وزن، بحر کے اہتمام کے ساتھ ساتھ غنائیت بھی لازم ہے۔ غزل کا کوئی ایک مصرعہ یا کوئی شعر خیالات وجذبات کی ترسیل کے لحاظ سے نثر کے کئی صفحات سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ نظم کی بعض اصناف کی طرح غزل بھی فارسی سے اردو میں داخل ہوئی ہے۔ شروع میں اردو شعرا فارسی کی زمینوں اور اس کے اثر تلے اردو غزل کے اشعار کہتے تھے لیکن یہ رویہ دیر تک قائم نہ رہا اور اردو غزل نے جلدی ہی اپنی جداگانہ روش اختیار کر لی۔ بعض ناقدین

نے اردوغزل کے اشعار کو چاول پر" **قل ھول اللہ**" لکھنے کا فن کہا ہے یعنی یہ صنف نہایت مشکل ہے۔غزل کے اشعار میں ردیف وقافیہ کا التزام نہایت ضروری ہے،غزل کی ساخت دیگر اصناف شاعری سے الگ ہوتی ہے۔غزل کے اشعار کی تعداد متعین نہیں تاہم کم ازکم پانچ اشعار اور زیادہ سے زیادہ پچیس اشعار پر مبنی غزل معیاری کہلاتی ہے۔غزل کا ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے۔اس میں شاعری کی مختلف صنعتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔اردوغزل میں قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، غالب، آتش، ذوق، مومن، داغ، فانی، فراق، مجروح، فیض اور ناصر کاظمی وغیرہ کو منفرد حیثیت حاصل ہے۔عزیز طلبا! ہم اس اکائی میں کی غزل کی ابتدا کے ساتھ متوسط دور کی غزلوں، جدید اردوغزل اور دورحاضر میں غزل کی خصوصیت پر اور اس کی فنی خوبیوں پر بات کریں گے۔اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ طلبا اس لائق ہوجائیں گے کہ

☆ اردوغزل کی ترویج وترقی پر اظہار خیال کرسکیں گے۔
☆ غزل کے مختلف ادوار پر تبصرہ کرسکیں گے۔
☆ غزل کی فنی خوبیاں بیان کرسکیں۔
☆ غزل کے نمائندہ شعرا کا تجزیہ پیش کرسکیں گے۔
☆ قدیم وجدید غزل گوئی کے امتیازات بیان کرسکیں اور
☆ عہد حاضر میں ہورہی صنفی، تکنیکی اور ہیئتی تبدیلی پر اظہار خیال کرسکیں۔

2.2 تمہید

غزل صنف شاعری کی ایک معروف شکل ہے۔عام طور پر لغات میں غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنا درج ہے لیکن یہ نظم کی وہ معروف صنف سخن ہے جس میں عشق و عاشقی، قرب الٰہی، خلق خدا سے محبت، انسان دوستی، حسن اخلاق، طرز معاشرت، سیاست وامارت غرض کہ انسانی معاشرے کے تقریباً سبھی افعال و خصوصیات کا عمومی وخصوصی ذکر کیا جاسکتا ہے۔حالاں کہ دور قدیم میں غزل کے مضامین عشق وعاشقی اور معرفت الٰہی تک ہی محدود سمجھے جاتے تھے۔ہیئتی اعتبار سے غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں مکمل اور جداگانہ معنی رکھتا ہے۔غزل کے ہر شعر میں الگ الگ مضمون باندھے جاسکتے ہیں۔اردو شاعری میں غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور نظم جیسی اصناف سخن اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں لیکن اردو شاعری کی ابتدا سے دور جدید تک غزل کی مقبولیت کی برابری کسی اور صنف شاعری کے حصے میں نہ آئی۔حالاں کہ غزل میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے کبھی اس کا سنہرا دور آیا تو کبھی اس پر جدیدیت کا رنگ چڑھا اور مختلف ادبی تحریکوں کے زیر اثر معمولی تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملی۔غزل ابتدا تا دم تحریر اپنی

جولانی اور شیرینی سے دیگر تمام اصناف ادب پر سبقت رکھتی ہے۔اس اکائی میں آپ طلبا ادب کے مختلف ادوار، ان ادوار میں غزل میں ہونے والی تبدیلی اور اثر کا جائزہ لیں گے ساتھ ہی ساتھ غزل کی فنی خصوصیات مثلاً مختلف صنعتوں کا استعمال اور صنائع لفظی و معنوی کے ساتھ ساتھ جدید رنگ تغزل کا بھی آپ جائزہ لیں گے۔

2.3 اردو غزل کی ابتدا

تمہید و تعارف میں آپ نے اردو غزل کے عمومی خصوصیات سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔اب اردو غزل کی ابتدا اور ابتدائی غزل گو شعرا کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اردو شاعری میں کون سی شعری صنف کا آغاز پہلے ہوا لیکن غزل کی مقبولیت سے یہ گمان غالب ہے کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں ہی غزلیں کہی گئی ہوں گی۔اردو زبان کے آغاز سے ہی غزل کی صنف اور اس کے مختلف اشعار کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔امیر خسرو جو کئی زبانوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے نے بھی اپنی ہندوی شاعری میں غزل کے ابتدائی نقوش چھوڑے ہیں۔ان کے علاوہ امیر خسرو کے پیر بھائی امیر حسن دہلوی کی غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا گیا تھا اس کا پتہ ملتا ہے۔امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی دونوں نے اردو یا ہندوی غزل کے اشعار میں فارسی اور بھاشا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔مثال کے لئے امیر خسرو کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کریں۔

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیاکوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں خواہ وہ دلی سلطنت کا عہد ہو یا پھر عہد مغلیہ اقتدار کی کشمکش کے ساتھ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی بولیاں اور زبانیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اردو نثر و نظم شمال کے ساتھ جنوب میں بھی اپنی قدامت کے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔دکن میں اردو زبان صوفیائے کرام کی وجہ سے عوامی بنی اور مستند ہوئی۔بہمنی دور میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے علاوہ دکن کے دیگر شاہی خاندانوں نے اردو کی ابتدائی خدمات میں اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔اس زمانے میں حالاں کہ مثنوی کا بول بالا رہا لیکن غزل کے شعرا نے بھی خوب خوب نام کمایا۔دکن کے جن شعرا نے غزل میں انفرادیت پیدا کی ان میں فیروز شاہ بہمنی، مشتاق اور لطفی کا ذکر بالخصوص کیا جانا چاہئے۔ان کے علاوہ خیالی، شیخ محمد گجراتی اور حسن شوقی کے کلام میں بھی غزل کے اعلیٰ نمونے کے اشعار ملتے ہیں۔دکن کے صنف غزل کی

آبیاری میں دبستان گولکنڈہ کے شعرا محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، عبداللہ قطب شاہ اور غواصی کے نام بطور خاص لئے جا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ عادل شاہی دور کے شعرا میں شاہ برہان الدین، سید شہباز حسینی، خواجہ محمد فانی، نصرتی، شاہ سلطان، ملک خوشنود اور ہاشمی بیجاپوری کے نام غزل گو شعرا کے طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

دکن کے جن دو شعرا نے شمال کے غزل گو شعرا کو بہت متأثر کیا بلکہ شمال والوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا وہ ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی ہیں۔ ولی غزل کے مستند قدیم شعرا میں سرفہرست ہیں۔ ولی کے کلام کی دلی آمد کا بہت شہرہ ہوا۔ دیوان ولی کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب 'آب حیات' میں لکھا ہے:

''غرض جب ان کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔لذت نے زبان سے پڑھا۔گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا''۔

(آب حیات، صفحہ 87)

دیوان ولؔی کے دہلی پہنچنے کے بعد اردو غزل گوئی میں انقلاب برپا ہو گیا۔شمال کے شعرا نے ولؔی کی زمینوں میں شعر کہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔ ولی کی غزلوں میں دکنی شاعری کی روایات، رجحانات اور لفظیات کا جو استعمال کیا گیا تھا ان سے شمال کے شعرا نے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کی ولی کی کلیات میں غزل کا مقام بہت بلند ہے۔شروع شروع میں انہوں نے فارسی کے موضوعات ومضامین، تشبیہات و استعارات، ترکیب اور ضرب الامثال کا بہت خوبصورتی سے اردو میں استعمال کیا۔ ولی کی غزلیں ثانوی درجات سے اعلی تعلیم کی درجات تک پورے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں جن سے ولی کی شاعرانہ عظمت کا اور ندرت زبان کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے
تجھ حسن آب دار کی تعریف کیا لکھوں — موتی ہوا ہے غرق تجھے دیکھ آب میں
تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا — جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا
تری انکھیاں کی مستی دیکھنے میں — گئی ہے پارسا کی پارسائی

ولی کی غزلوں کے مطالعے سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے یہاں شمال وجنوب یعنی دہلی ودکن دونوں

خطے کی زبان کی خصوصیات موجود ہیں۔ ولی نے اپنے کلام میں عربی و فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کو مقامی بولیوں اور الفاظ سے اس قدر ملا کر استعمال کیا ہے کہ زبان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں معنوی و صوتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بندش الفاظ، نغمگی اور بھرپور غنائیت پائی جاتی ہے۔

ارض دکن کے دوسرے معروف و مشہور شاعر جنہوں نے ابتدائی غزل گوئی میں اعلی مقام پایا سراج اورنگ آبادی ہیں۔ سراج اورنگ آبادی کا پورا نام سید سراج الدین تھا۔ انہوں نے اردو شاعری کے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن صنف غزل کے لئے معروف و مشہور ہوئے۔ ولی کے بعد سراج ایسے دکنی شاعر ہیں جنہوں نے دکنی شاعری کی عظیم روایت کو شمالی ہندوستان سے جوڑ دیا۔ سراج نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت میں گزارا اس وجہ سے انہیں عمومی طور پر صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ سراج کی شاعری کی ایک اور خوبی ہند ایرانی کلچر کا ایک دلکش اور متوازن امتزاج بھی ہے۔ انہیں فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی اور وہ قدیم دکنی شاعری کے رجحانات اور میلانات سے بخوبی واقف تھے۔ دو صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی سراج کی غزلیں قاری کی ذہنوں پر اپنا دلکش اثر چھوڑتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں سراج کی شاعری کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ پر کھڑی ہے جہاں سے میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن، غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آتے ہیں۔''

سراج اورنگ آبادی کی شاعرانہ انفرادیت اور عظمت کے مثال کے لئے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا　　سراپا موم یا سنگ ہو جا

ہر گز مریض ہجر کو بن وصل نہیں علاج　　اس کی ادا کی نرگس بیمار کی قسم

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جوں دھری تھی یونہی دھری رہی

اردو غزل کے ابتدائی دور میں دکن کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں بھی کئی ایسے شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے غزلیہ شاعری کی بنیادیں مستحکم کیں۔ ابتدائی دور کے جن شعرا نے اردو غزل کے بال و پر کو قوت پرواز عطا کیا ان میں خان آرزو، آبرو، حاتم، شاکر، ناجی، مضمون، بیان، امید، مخلص اور مظہر ایسے صاحب قلم اردو غزل گو شعرا ہیں جنہوں نے ابتدائی ایام میں اس صنف سخن کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اچھی راہ قائم کی۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کریں۔

نہ دیوے لے کے دل وہ جعد مشکیں	اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو	(آبرو)
اس درجہ ہوئے خراب الفت	جی سے ایسے اپنے اتر گئے ہم	(حاتم)
جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں	زندگانی کا کیا بھروسا ہے	(آرزو)

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ کس شاعر نے ہندوی شاعری میں غزل کے ابتدائی نقوش چھوڑے ہیں؟

۲۔ دبستان گولکنڈہ کے چند اہم شعرا کے نام لکھیے۔

۳۔ دہلی میں ولی دکنی کے دیوان کی آمد سے شمالی ہند کے شعرا پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

۴۔ سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کیجیے۔

2.4 دور متوسط کی اردو غزل

اردو شاعری کا دور متوسط کئی اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کو اردو شاعری بالخصوص اردو غزل گوئی کا سنہرا دور کہنا چاہئے۔ اسے عرف عام میں عہد میر اور سودا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں تمام صنف سخن اپنے کمال عروج پر نظر آتے ہیں اور اسی دور میں صنف غزل نے بھی سب سے زیادہ ترقی پائی۔ اس دور کا امتیاز یہ ہے کہ اردو شعرا نے فارسی کی تقلید چھوڑ کر خالص اردو غزل گوئی میں مقام پیدا کیا۔ اس دور کو مختلف دبستان میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ شمال بالخصوص دلی میں غزلیہ شاعری میں ایسے درخشندہ ستارے نظر آتے ہیں جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑی۔ اس دور کے معروف و مشہور شعرا میں شہنشاہ تغزل میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، میر حسن، مرزا اسداللہ خاں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر اور نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ وغیرہ کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ یہ دور عہد مغلیہ کے زوال کا دور تھا لیکن اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کے لئے عروج کا دور کہا جاسکتا

ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق خاقانیٔ ہند کے خطاب سے نوازے گئے تو مرزا غالب کو نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطاب ملے۔ یہ وہی دور ہے جس میں حکیم مومن خاں مومن نے اپنی غزل کے خصوصی آہنگ سے اور اچھوتے انداز سے پوری اردو شاعری کو متأثر کیا۔ اسی دور میں شیفتہ نے اردو زبان بالخصوص شاعری میں صاف ستھری زبان استعمال کرنے پر زور دیا۔ اسی دور میں اعلی پیمانے کے نقاد اور تذکرہ نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے آنے والی نسلوں تک اس دور کی خصوصیات کو اور انتخاب شاعری کو پہنچایا۔ اس دور میں دبستان دلی کے شعرا کی خصوصیات میں تصوف کا رنگ اور فلسفہ وحدۃ الوجود خاص ہیں۔ یہ وہی دور ہے جس میں دلی متعدد بار اجڑی اور آباد ہوئی۔ شعرا خانہ برباد ہوئے۔ فکر معاش نے ان کی تخلیقی فکر میں خلل پہنچایا لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ دہلی کے شعرا اپنے اشعار میں محبوب کا بہت احترام کرتے ہیں۔ یہاں حسن و عاشقی کا مطلب خارجی معاملات نہیں بلکہ داخلی احساسات و جذبات ہیں۔ اس دور کی شاعری میں حقیقی کیفیات و واردات قلب کا بیان ملتا ہے۔ رنگین مزاجی کم ہے۔ تصنع و بناوٹ بھی نہیں ہے بلکہ ان کی جگہ خیالات میں سادگی و سلاست و روانی ہے اور یہی دبستان دلی کی غزلیہ شاعری کی خصوصیات کہی جاسکتی ہے۔

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا　　یکسر و استخوان شکستوں سے چور تھا　　(میرؔ)
کہنے لگا کے دیکھ کر چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا　　(میرؔ)
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا　　(میرؔ)
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا　　(میرؔ)
ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی　　(غالبؔ)
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا　　(غالبؔ)
بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے　　(غالبؔ)
ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا　　(غالبؔ)
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا　　(غالبؔ)
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا　　(غالبؔ)
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن　　بہت بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے　　(غالبؔ)
مزے جب موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے　　مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے　　(ذوقؔ)
پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے　　حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے　　(ذوقؔ)

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا (میرؔ)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا (میرؔ)

نام منظور ہے تو فیض کے سامان بنا پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا (غالبؔ)

اے شمع تری عمر طبعی ہے ایک رات ہنس کر گزار اسے یا رو کر گزار دے (غالبؔ)

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے (ذوقؔ)

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں (ظفرؔ)

ظفر آدمی اسے نہ جانئے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا جسے عیش میں یاد خدا نہ رہا جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے (ظفرؔ)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

حالِ دل ، یار کو، لکھوں کیوں کر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (مومنؔ)

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ہوش و ہواس تاب و تواں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا (داغؔ)

شمالی ہند نے بھی جنوبی ہند کی طرح ہی مختلف خطوں نے اردو غزل کی آبیاری کی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ہم انہیں مختلف دبستانوں کے نام سے جانتے ہیں۔ دبستان لکھنؤ، دبستان عظیم آباد، دبستان رامپور وغیرہ نے غزل گوئی کی مختلف طریقے سے خدمات انجام دی۔ دلی کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بعض شعرا نے اودھ کی خوش حال ریاست کا رخ کیا اور دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑی۔ معاشی خوش حالی اور معاشرے میں عیش و عشرت کی وجہ سے یہاں کے شعرا نے داخلیت کی جگہ خارجیت سے زیادہ کام لیا اور عشق حقیقی کی جگہ عشق مجازی غزل کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اب غزل میں شاعر کا محبوب تذکیر کی جگہ تانیث ہو گیا۔ عورتوں کے معاملاتِ عشق غزلیہ اشعار میں بیان کئے جانے لگے اور اکثر و بیشتر ابتذال کی حد تک غزل کا شعر نیچے گر گیا حالاں کہ لکھنوی شعرا نے صنائع و بدائع کا زیادہ استعمال کیا اور زبان کی فصاحت پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ غزل کے شعرا میں آتش، ناسخ، شوق اور انشا نے زیادہ نام کمایا۔ آتش کا ماننا تھا کہ شاعری مرصع سازی سے کم نہیں۔ چنانچہ انہوں نے زور دے کر کہا:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

داخلیت کی جگہ خارجیت نے گو کہ کافی زور پکڑا تاہم کچھ شعرا کے یہاں غزل کے اصل رنگ بھی نمایاں ہیں مثلاً:

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے (آتشؔ)

بت خانہ کھود ڈالئے ، مسجد کو ڈھایئے دل کو نہ توڑیئے کہ خدا کا مقام ہے (آتشؔ)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں (آتشؔ)

لکھنؤ کے بعد جس دبستانِ شاعری نے سب سے نمایاں مقام غزلیہ شاعری میں حاصل کیا وہ دبستان عظیم آباد تھا۔ دبستان عظیم آباد کی غزلیہ شاعری میں دبستان دلی کی طرح ہی سادگی اور سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔ عشقیہ جذبات کی فراوانی تو یہاں ہے لیکن اعتدال کے ساتھ۔ عظیم آباد کے غزل گو شعرا نے پاکیزگی ونفاست کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ حالاں کہ جغرافیائی لحاظ سے عظیم آباد کا خطہ لکھنؤ سے زیادہ نزدیک ہے لیکن یہاں کے شعرا نے دہلوی شاعری کی راہ کو زیادہ پسند کیا۔ کہیں کہیں دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی دونوں کی پیروی میں اشعار کہے۔ جوششؔ، فقیہؔ، دردمندؔ، راسخؔ اور شاد عظیم آبادیؔ غزلیہ شاعری کے دبستان عظیم آباد کے نمائندہ شاعر کہے جاسکتے ہیں۔ دبستان عظیم آباد کے نمائندہ غزل گو شعرا کے چند اشعار مثال کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا زمین کا سخت ہوجانا فلک کا دور ہوجانا

ہمارے زخم دل نے دل لگی اچھی نکالی ہے چھپائے سے تو چھپ جانا مگر ناسور ہو جانا

جو سچ پوچھو تو شادؔ اپنے کئے سے کچھ نہیں ہوتا خدا کی دین ہے انسان کا مشہور ہوجانا (شادؔ عظیم آبادی)

کوئی سمجھ نہ سکا جسے اس جہان میں اس جانِ جاں کا محرم سرِ نہاں ہوں میں

کچھ نہ سمجھے گئے کسو سے تم بارے اتنا تو ہم نے سمجھا ہے

ہونٹ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ راسخؔ آہ

بندے سے صاحب حال تمہارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

(راسخؔ عظیم آبادی)

دبستان عظیم آباد کے بعد علم وادب کا ایک مشہور گہوارہ شہر رامپور تھا۔ مغربی یوپی کی ریاست رامپور کے نوابین نے علم وادب کی بڑھ چڑھ کر خدمت کی اور یہی نہیں دلی کے اجڑنے کے بعد کئی معروف ومشہور غزل گو شعرا کی والی ریاست رامپور نے قدردانی کی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم خود بھی اچھے شاعر تھے اور مشہور زمانہ شعرا غالب ومومن سے فیض حاصل کر چکے تھے۔ ان کے بعد کے نوابین نے بھی مختلف صنف سخن کے شعرا کی اعانت ہی نہیں بلکہ قدردانی بھی کی۔ دبستانِ رامپور، دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کا سنگم قرار پایا۔ چنانچہ یہاں کی غزلیہ شاعری میں رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ سادگی ومعنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ آخر دم تک کچھ شعرا نے دبستانِ لکھنؤ کی پیروی کی تو کچھ

نے دبستانِ دہلی کی۔ دبستان رامپور کے بنیاد گزاروں میں رامپور کے نوابین کے علاوہ داغ دہلوی، امیر لکھنوی، اثر رامپوری، امیر مینائی اور بحر لکھنوی کا خاص مقام ہے۔ دبستانِ رامپور سے وابستہ چند شعرا کے اشعار دبستانِ رامپور کی سادگی اور معنی آفرینی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال پیش ہے۔

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا — حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا
تیری یاد ہے یا ہے تیرا تصور — کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا (داغ)
عشق میں شکوہ کفر ہے اور ہر التجا حرام — توڑ دے کاسۂ مراد عشق گداگری نہیں
انگور میں تھی یہ مئے پانی کی چند بوندیں — جس دن سے کھینچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے (اثر رامپوری)

قریب ہے یاروں روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

(امیر مینائی)

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ اردو شاعری کے دورِ متوسط کو بالخصوص اور عرف عام میں کیا کہا جاتا ہے؟

۲۔ ''متوسط دور کی شاعری کو اردو شاعری کا سنہرا دور کہنا چاہئے'' اس قول کی وضاحت کیجئے۔

۳۔ دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کے علاوہ کس دبستان شاری نے غزلیہ شاعری میں نمایاں مقام حاصل کیا؟

۴۔ دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلی کی غزل گوئی میں فرق واضح کیجئے۔

2.5 جدید اردو غزل

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (1857) کی وجہ سے معاشی وسماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی ادبی محاذ پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ خاص طور سے اسی کی اساس پر ادب میں اصلاحی تحریک اور جدیدیت کا آغاز ہوا۔ بالخصوص شاعری میں حالی کی اصلاحی تحریکوں نے شاعری کے پیراہن کو متاثر کیا اور شاعری سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا جانے لگا۔ حالی نے غزل کی اصلاح کے لئے بھی کئی مفید مشورے دیئے۔ اب شاعری خصوصاً اردو غزل نے عشق و عاشقی، حسن پرستی، پندونصح، تصوف وفلسفہ، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشھود سے نکل کر انسانی زندگی کے موجودہ نشیب وفراز اور سماجی کشمکش کو اپنا پیرایہ مضامین بنایا۔ اب غزل میں انفرادی واجتماعی رویوں، سیاسی صورت حال، سماجی

انقلابات اور معاشی اصلاحوں کا بیان ضروری سمجھا جانے لگا اور ایسے شعرا کی عوامی داد و تحسین سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ جدیدیت کے رجحانات اور ترقی پسندی نے بھی اردو غزل کو خاصا متأثر کیا۔ اردو غزل پر متعدد بہ نقطہ نظر سے نقد و تبصرہ ہوا اور غزل کی معنویت اور افادیت پر نقاد ادب نے اپنی اپنی بساط سے متعدد مشورے اور تجاویز پیش کیں۔

کسی نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تو کسی نے اس کی گردن مارنے کی صلاح دی اور بعض نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا۔ لیکن موجودہ زمانے کے رجحانات اور عالمی ادب پر گہری نظر رکھنے والے باشعور ناقدین ادب نے غزل سے انسانی اصلاح اور معاشرتی بھلائی کا کام لینے کی تجویز پیش کی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے جدید غزل کو عشق و محبت تک محدود نہیں رکھنے کی صلاح دی۔ غیر مانوس الفاظ کو ترک کرنے اور مانوس الفاظ کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ غزل میں سادگی و صفائی کے خیال رکھنے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی مشورہ دیا کہ صنائع و بدائع کو بنیاد بنا کر شعر نہ کہا جائے بلکہ اشعار میں خود بخود کچھ صنعتیں آ جائیں تو شعری حسن بڑھ جائے۔ اس کے علاوہ مشکل زمینوں سے پرہیز، ردیف و قافیہ کی مناسبت اور غیر مردف غزلوں کی چلن کی بات بھی کہی گئی۔ خود حالی اور ان کے ہمنواؤں نے ان اصولوں کی پاسداری بھی کی اور ہم عصروں پر اس کا اثر بھی ڈالا۔ جدید غزل گو شعرا میں حالی، فانی، حسرت، جوش، جگر، شاد، سیماب اور چکبست کے ساتھ فراق یگانہ، اثر لکھنوی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال وغیرہ غرض کہ غزل گو شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جنہوں نے جدید اردو غزل کے پیراہن کو وسعت بخشی۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہو۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں | اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں | (حالؔی)
دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم | بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے | (فانؔی)
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں | الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں | (حسرؔت)
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں | کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں | (شاؔد)
ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری | کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی | (جگؔر)
کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے | جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے | (سیماؔب)
زندگی نام تھا جس کا اسے کھو بیٹھے ہم | اب امید کی فقط جلوہ گری باقی ہے | (چکبسؔت)

بیسویں صدی کے اوائل میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نو آبادیاتی نظام کا جبر و تشدد بڑھا۔ کہیں یہ نظام بکھر گیا اور بعض ملک آزاد ہو گئے اور کچھ خطوں میں یہ نظام مضبوط بھی ہوا۔ مختلف ممالک میں مختلف نئے سماجی و سیاسی افکار سامنے آئے۔ کئی انقلابات آئے۔ خطوں اور ملکوں کی تقسیم ہوئی۔ جنگ، ہجرت، غربت اور مہاجرین کے مصائب نے جدید غزل گو شعرا کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان تبدیلیوں

کی وجہ سے کئی ادبی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ان سب حالات و واقعات نے شاعری بالخصوص اردوغزل کو بہت متأثر کیا۔شاعری بالخصوص غزل کا پیرایہ بیان بھی تبدیل ہوا اور جدید اثرات، حالات وواقعات، حادثات وسانحات اور گردشِ زمانہ کی ٹیس غزل گوشعرا نے بہت نزدیک سے اور بہت شدت سے محسوس کی۔ چنانچہ جدید اردوغزل پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ بعض شعرا کے یہاں غزل کے قدیم پیراہن یکسر بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دورِجدید کی نمائندگی کرنے والوں میں مجروح سلطان پوری، فیض احمد فیض، جمیل مظہری، اختر شیرانی، احسان دانش، روش صدیقی، ن م راشد، اختر الایمان، اسرارالحق مجاز، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ناصر کاظمی، احمد فراز، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، وحید اختر، مظہرامام، کلیم عاجز، پروین شاکر، ظفر اقبال، سلطان حیدر، بشیر بدر، خمار بارہ بنکوی، کشور ناہید اور جاں نثار اختر کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے　　(اقبالؔ)

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں　　کارِجہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر　　(اقبالؔ)

تیرے جمال کی تنہاؤں کا دھیان نہ تھا　　میں سوچتا تھا میرا غم کسار نہیں　　(فراقؔ)

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار　　رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ　　(مجروحؔ)

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے　　تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے　　(فیضؔ)

آشنا ہوکر تغافل آشنا کیوں ہو گئے　　باوفا تھے تم تو آخر بے وفا کیوں ہو گئے　　(اختر شیرانی)

احسانؔ ہے بے سود گلہ ان کی وفا کا　　چاہا تھا انہیں ہم نے خطاوار ہمیں تھے　　(احسان دانش)

آرزو کیا غم وحسرت کے سوا کچھ بھی نہیں　　درد کیا تلخ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں　　(روشؔ صدیقی)

جہاں غریب کو نان جویں نہیں ملتی　　وہاں حکیم کے درس خودی کو کیا کیجئے　　(ن م راشد)

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے　　سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے　　(مخدوم)

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے　　یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے　　(جذبی)

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا　　راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا　　(سردار جعفری)

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا　　بات نکلی تو ہر بات پہ رونا آیا　　(ساحرؔ)

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی　　کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی　　(ناصر کاظمی)

رنجش ہی سہی دل کو دکھانے کے لئے آ　　آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ　　(احمد فراز)

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے　　اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے　　(شہریار)

میں سراپا ہوں دعا تو میرا مقصود دعا	بات یوں کر کہ مری بات مکمل ہو جائے	(وحید اختر)
دوست ناداں ہو تو دشمن سے برا ہوتا ہے	مجھ کو اپنے دلِ ناداں پہ بھروسا تھا کبھی	(مظہر امام)
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ	تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو	(کلیم عاجزؔ)
نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں	خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون	(پروین شاکر)
خواب کی تعبیر پر اصرار ہے جن کو ابھی	پہلے ان کو خواب سے بیدار ہونا چاہئے	(ظفر اقبال)
وہ لوگ ہی ہر دور میں محبوب رہے ہیں	جو عشق میں طالب نہیں مطلوب رہے ہیں	(جاں نثار اختر)

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ کس شاعر نے اردو غزل کو عشق و محبت تک محدود نہ رکھنے کی صلاح دی؟

۲۔ جدید اردو غزل کے پانچ نمائندہ شعرا کے دو دو اشعار تحریر کیجئے۔

4.6 دورِ حاضر کی اردو غزل

آپ نے اب تک کے مطالعے سے یہ سمجھ لیا گیا ہوگا کہ اولین دور میں غزل کے مضامین کیا تھے؟ اور غزل کہنے والوں کا مطمع نظر کیا تھا؟۔ متوسط دور میں اردو غزل صنف شاعری کی سب سے معروف صنف بن کر ابھری اور غزل کے افہام و تفہیم کا دائرہ وسیع تر ہوا۔ امتدادِ زمانہ کے اثرات متوسط دور کی غزلوں کے اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جیسے جیسے انسانی معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں زندگی زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔ شاعری بالخصوص غزل پر زمانے کے انقلابات، سماجی تبدیلیوں اور معاشی مشکلات کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ چنانچہ دورِ جدید کے غزل گو شعرا کے اذہان پر مرتسم ہونے والے مذکورہ اثرات کا عکس ان کے اشعار پر دیکھے جا سکتے ہیں جن کا مطالعہ آپ نے کیا ہے۔ اب عہدِ حاضر کی غزل گوئی جس کا تذکرہ نامکمل رہے گا کیوں کہ یہ ابھی جاری ہے، کا مطالعہ کریں گے۔ ظاہر ہے آپ طلبا نے عہدِ حاضر کے بیشتر شعرا کو دیکھا بھی ہے، ان کے اشعار سنے بھی ہیں اور ان پر ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

کسی بھی ادب کی تخلیق خلا میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ شعر کی تخلیق شعرا کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ شاعر بھی ایک عام گوشت پوشت کا انسان ہوتا ہے لیکن اس کا حساس دل و دماغ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، نابرابریوں، ظلم و تشدد، تحفظ اور عدم تحفظ، انسانی روابط، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، خود غرضی، لالچ اور جی حضوری غرض کہ ان سارے افعال و کردار کا جیتا جاگتا گواہ ہوتا ہے اور اس کے زیرِ اثر تخلیق پانے والے اشعار آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتے

ہیں۔شاعر جن سماجی ناہمواریوں سے گزرتا ہے،زندگی کی جن کشاکش سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اپنے آس پاس گزرتے حالات کو دیکھتا ہے اپنے اشعار سے اس کی عکاسی کرتا ہے ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک مصور خاکا بنا کر اس میں رنگ بھرتا ہے۔ ہندو پاک میں اردو غزل کے سیکڑوں ایسے شعرا موجود ہیں یا ابھی ابھی دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں ان کے اشعار ان کے تجربات کی گواہی دے رہے ہیں۔سیاست،سماجی تانے بانے میں ٹوٹ پھوٹ،مذہبی شعبدہ بازی ہو یا اپنی تشخص کے لئے ہٹ دھرمی۔ماحولیاتی تبدیلی ہو یا سیاسی بازی گری عہدِ حاضر کے شعرا نے ان سبھی موضوعات پر دل کو چھو لینے والے اور احساس کو جلا دینے والے اشعار کہے ہیں۔اس چھوٹی سی اکائی میں ناممکن ہے کہ عہدِ حاضر کے تمام شعرا کی غزلوں سے اشعار پیش کئے جا سکیں تاہم چند نمائندہ شعرا کے کچھ اشعار مذکورہ بیانات کی تصدیق کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا
(بشیر بدرؔ)

رہنے کو گھر بھی مل جاتا چاک جگر بھی سل جاتا
جالبؔ تم بھی شعر سناتے جاکے اگر درباروں میں
(حبیب جالبؔ)

کہوں کس طرح کہ وہ بے وفا ہے
مجھے اس کی مجبوریوں کا پتہ ہے
(خمار بارہ بنکویؔ)

نظر میں ہے جلتے مکانوں کا منظر
چمکتے ہیں جگنو تو دل کانپتا ہے
(خمار بارہ بنکویؔ)

گزرتا ہے ہر شخص چہرہ چھپائے
کوئی راہ میں آئینہ رکھ گیا ہے
(خمار بارہ بنکویؔ)

اچھی بھلی تھی دنیا گزارے کے واسطے
الجھے ہوئے ہیں اپنی ہی خود آگہی سے ہم
(ندا فاضلی)

کھول کے کھڑکی چاند ہنسا پھر چاند نے دونوں ہاتھوں سے
رنگ اڑائے پھول کھلائے چڑیوں کو آزاد کیا
(ندافاضلی)

غم حیات کا یوں بھی کبھی صلہ مل جائے
تلاش آگ کی ٹھہرے مگر خدا مل جائے
(مہدی پرتاپ گڑھی)

جو آج صاحبِ مسند ہیں کل نہیں ہوں گے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے
(راحت اندوری)

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے
(راحت اندوری)

آندھیاں زور دکھائیں بھی تو کیا ہوتا ہے
گل کھلانے کا ہنر بادِصبا جانتی ہے
(منظر بھوپالی)

کون آئے گا یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا ہوگا
(کیف بھوپالی)

انہیں لحاظ نہیں ہے جو میری مرضی کا
تو میں بھی مرضی اغیار پر نہیں چلتا
(رؤف خیر)

پھر آج میرے درد نے مجھ کو منا لیا
کوئی کسی عزیز سے کب تک خفا رہے
(شہپر رسول)

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔عہدِ حاضر میں شاعروں نے کن موضوعات کوغزل کے اشعار میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۔عہدِ حاضر کے دس نمائندہ شعرا کے نام ان کے ایک ایک شعر کے ساتھ لکھیے۔

2.7 خلاصہ

اس اکائی میں اردوغزل کے آغاز وارتقا کے مختلف منازل کا جائزہ لیا ہے۔اردوغزل کی ابتدا اس وقت سے تسلیم کی جاتی ہے جب اردوزبان کے خدوخال ابھر رہے تھے۔اردوزبان کی ترویج وترقی میں صوفیائے کرام نے اہم رول ادا کیا۔دکنی شعرا نے غزل میں انفرادیت پیدا کئے اورصنف غزل کوسجانے سنوارنے میں دبستانِ گولکنڈہ کے شعرا قلی قطب شاہ، ملا وجہی،عبداللہ قطب شاہ اورغواصی کے علاوہ سید شہباز حسینی ،خواجہ محمد فانی ،نصرتی ،شاہ سلطان اور ہاشمی بیجاپوری نے بھی کارنامے انجام دیئے۔دکن کے جن دوشعرا نے صنف غزل کودوام بخشا وہ ولی اورنگ آبادی اورسراج اورنگ آبادی ہیں۔ولی کی غزل کا چرچہ جب دلی میں ہواتو دلی کے شعرا نے اس کا اثر قبول کیا۔بعض شعرا نے ولی کی زمین میں غزلیں کہیں اوراس پرفخرمحسوس کیا۔سراج اورنگ آبادی نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت میں گزارا اس لئے اس کی شاعری پرصوفیانہ رنگ غالب ہے۔شمالی ہند کے ابتدائی دور کے جن شعرا نے اردوغزل کے گیسوسنوارے ان میں خان آرزو، آبرو، حاتم، شاکر، ناجی، مضمون، بیان، امیداورمظہر کے نام خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔اردوغزل کا متوسط دوراردوشاعری کا سنہرا دورکہا جاتا ہے۔اس دور میں صنف شاعری میں بالخصوص غزل گوئی میں بہت سی نئی زمینیں تلاش کی گئیں۔زبان میں کافی سدھار ہوا۔متروک الفاظ شاعری سے ترک کئے گئے۔یہ وہی دور ہے جس میں شہنشاہ غزل میرتقی میر نے غزل گوئی میں بہترین کارنامے انجام دیئے جس کی وجہ سے ان کے ہم عصر اور بعد کے شعرا نے میر کو اپنا استاد تسلیم کیا۔اسی دور میں مرزا محمد رفیع سودا،خواجہ میر درد، میر سوز، میر حسن، مرزا غالب ومومن، بہادر شاہ ظفر اور شیفتہ وغیرہ نے غزل گوئی میں اعلی مقام حاصل کیا۔متوسط دور میں شاعری کے کئی دبستان قائم ہوئے ان میں دبستانِ دہلی، دبستان لکھنؤ، دبستان عظیم آباداوررامپور خاص ہیں۔دبستان دہلی کے شعرا کا رنگ داخلی شاعری، سلاست وسادگی اورعشق حقیقی تھا جب کی لکھنؤ کی دبستا شاعری میں حسن وعشق کی مجازی داستانیں، رنگینی، زبان کی تراش خراش اورصنائع بدائع کا زیادہ استعمال ہوا۔دبستان عظیم آباداوررامپور پر دہلی اورلکھنؤ دونوں دبستانوں کے شعرا کا اثر دیکھنے کوملتا ہے۔1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سماجی، سیاسی، ومعاشی حالت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔عالمی پیمانے پرآنے والے انقلابات ،مختلف طرح کی تحریکیں،مختلف ملکوں کی حریتی تحریک نے ادب پربھی گہرا اثر ڈالا اورغزل

گوئی اس سے اچھوتا نہیں رہی۔ چنانچہ جدید غزل گوئی میں شعرا نے ان حالات وواقعات اور نظریات کا اثر قبول کرتے ہوئے رنگِ تغزل میں کی تبدیلیاں کی۔ شاعری سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا جانے لگا۔ اب غزل گوئی صرف عشق و عاشقی، حسن پرستی، پند و نصح، تصوف وفلسفہ، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے نکل کر انسانی زندگی کے نشیب وفراز اور سماجی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا۔ معاشی نابرابری، سرمایہ دارانہ نظام سے پیدا شدہ مسائل کا بیان بھی ہونے لگا۔ عزیز طلبا! اس روش پر چلنے والے شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں فیض احمد فیض، جمیل مظہری، اختر شیرانی، اختر الایمان، روش صدیقی، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ناصر کاظمی، احمد فراز، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، وحید اختر، کلیم عاجز، پروین شاکر وغیرہ کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ عہد حاضر کی غزل گوئی میں غزل کے مفہوم و تفہیم کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ انسانی مسائل میں ہو رہی تبدیلیاں، معاشی مشکلات، سیاسی چپقلش اور غربت وافلاس کا اثر عہد حاضر کی اردو غزل پر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ عہد حاضر کے شعرا میں بشیر بدر، راحت اندوری، حبیب جالب، خمار بارہ بنکی، شہپر رسول اور ہم عصر شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ آپ طلبا کو چاہئے کہ عہدِ حاضر کے شعرا کے کلام کو یکجا کریں اور ان کے کلام کا مطالعہ بھی کریں۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

(ا) درج ذیل سوالوں کے مختصر جوابات لکھیے۔

ا۔ اردو شاعری کے مختلف دبستانوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۲۔ دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کی خصوصیات کی وضاحت کیجئے۔

۳۔ عہدِ حاضر کے شعرا پر کس طرح کے سماجی ومعاشی اثرات مرتب ہیں اظہار خیال کیجئے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

اردو غزل کی ترویج میں جنوب کے شعرا کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

ولی دکنی کے غزلوں کی خصوصیات اور شمال میں ان کی غزلوں کے اثرات پر تبصرہ کیجئے۔

دورِ متوسط غزل گو شعرا کی خصوصیات کا مختصرا جائزہ لیجئے۔

2.9 فرہنگ

غنائیت	نغمے کی کیفیت، موسیقیت
ترسیل	بھیجنا، روانہ کرنا
آب دار	صاف، چمکیلا
لعل بدخشاں	عمدہ لعل (بدخشاں کا)
نرگس	ایک پھول، مجازاً محبوب کی مست آنکھ
جعد مشکیں	گھونگھریالے سیاہ بال، سیاہ چوٹی
استخوان	ہڈی
بازیچہ اطفال	بچوں کا کھیل
نشاط	خوشی، شادمانی، فرحت، مزہ
پیرہن	لباس
خلد	جنت، بہشت
آفاق	افق کی جمع، آسمان کے کنارے، دنیا، جہان
مرصع ساز	نگینے یا جواہرات جوڑنے والا
انجم	(نجم کی جمع) ستارے
مہ کامل	پورا چاند
تحلیل	گھلنا
مطمح	نظر پڑنے کی جگہ، مقصود
مرتسم	نشان کیا گیا، مہر کیا گیا
کشاکش	کھینچا تانی، تکرار، جھڑپ
شعبدہ بازی	جادوگری، نظر بندی

2.10 معاون کتابیں

1۔ اختر انصاری — غزل اور غزل کی تدریس، NCPUL، نئی دہلی۔ 2001

2۔ محمد حسین آزاد — آب حیات، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ

3۔ الطاف حسین حالی — مقدمہ شعر و شاعری، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔

4۔ نورالحسن نقوی — تاریخِ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ 2009

☆☆☆

اکائی:3۔ فانی بدایونی: عہد شخصیت اور فن

ساخت:

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 فانی بدایونی کا عہد

3.4 فانی بدایونی کی حیات وشخصیت

3.5 فانی بدایونی کی ادبی خدمات

3.6 فانی بدایونی کی غزل گوئی

3.6.1 فانی بدایونی کے منتخب غزلوں کی تشریح

3.7 خلاصہ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 فرہنگ

3.10 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

اردو ادب اور غزل کی تعلیم کے اغراض ومقاصد بڑے ہمہ گیر و گہرے ہیں۔ ادبی لطف وحسن شناسی کا جذبہ بیدار کرنا تو اس کا مقصد ہے ہی اِسی کے ساتھ آپ میں زبان دانی کی نشوونما، اظہارِ خیال کی صلاحیت، ادبی تحسین کا مادہ پیدا کرنا، جذباتی پختگی واستواری حاصل کرنے میں مددگار ہونا آپ کے ذہنی عمل کو حرکت میں لانا، شوق کو بیدار کرنا، اشعار کو روانی، صحیح تلفظ اور مناسب زیر وبم کے ساتھ پڑھنے کی مشق بہم پہنچانا وغیرہ نہایت اہم مقاصد ہیں۔ بالخصوص فانی کی غزلیات کا صوتی آہنگ وموسیقی کی گونج آپ اپنے ذہنوں میں محسوس کریں گے۔ فانی کے اشعار میں زندگی کے حقائق اور شاعرانہ تخیل کا جو حیرت انگیز امتزاج پایا جاتا ہے اُس سے آپ کو لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم ہوگا۔ فانی کی غزلوں کے موضوعات اور ساحرانہ طرز بیان سے واقف کرانا اس اکائی کے مقاصد ہیں۔ فانی بدایونی کی شاعرانہ

خصوصیات سے آپ کو آگاہ کرانے کے لئے یہ اکائی نصاب میں شامل ہے۔آپ یقیناً فانی کی شاعری کی معلومات حاصل کریں گے اور محظوظ بھی ہوں گے۔

3.2 تمہید

اس اکائی میں فانی بدایونی کے عہد اور اُن کی حیات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور اُن کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا جائے گا تا کہ اُن کی شعری بصیرت سے آگاہی حاصل ہو۔ یہاں آپ کے مطالعہ کے لئے اُن کی دو اہم غزلیں بھی ہوں گی۔ ان غزلوں کے تمام اشعار کی تشریح سادہ اور عام فہم زبان میں کی جائے گی اور ان پر مجموعی تاثر کا اظہار بھی کیا جائے گا۔ اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو فانی بدایونی کی زندگی اور شاعری سے متعلق معلومات حاصل ہوگی۔

3.3 فانی بدایونی کا عہد

فانی بدایونی نے جب آنکھ کھولی، ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے تباہ کن اثرات واضح تھے۔ یہاں کی تہذیب و معاشرت اور زبان کو مٹایا جا رہا تھا۔ خاص طور پر مسلمانوں کی زمین، جاگیریں ضبط کی گئی تھیں۔ فارغ البالی ختم ہوگئی۔ مسلمان معاشی تنگ دستی و بیروزگاری کا شکار تھے۔ کھوئی ہوئی عزت، شہرت و دولت کا احساس شدید تھا۔ ذہن عجیب طرح کی کیفیت سے دوچار تھے۔ انحطاط پذیر معاشرے و مایوس کن حالات میں نوجوانوں نے لہوولعب و عشرت کو اپنا شیوہ بنالیا تھا۔ سرسید احمد خاں نے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ہر طرح کی کوشش کی۔ درس گاہیں و ادارے قائم کئے۔

حالیؔ نے خود اصلاحی نظمیں لکھی اور اردو شاعری خصوصاً غزل کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے موجودہ حالات، قوم کی بدحالی و بے بسی دور کرنے افادی ادب کا مشورہ دیا۔ دہلی ایک عرصہ تک اردو شاعری کا مسکن و مامن تھا۔ شاہانِ دہلی کی حکومت ختم ہوجانے، تلاشِ معاش کی دقتیں، شعراء کی بے قدری، بیکاری ان وجوہات سے دلی کی ادبی سرگرمیاں ختم ہوگئیں اور شعراء نے دوسرے مقامات کو مستقر بنانا بہتر سمجھا۔ پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رخ کیا۔ دہلی چھوڑ کر دوسری ریاستیں فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد، تانڈہ شعراء کے مرکز قرار پائے۔ حیدرآباد کے والی ریاست اہل سخن

کے قدردان و مربی تھے۔ حیدرآباد کی سلطنت آصفیہ مسلمانوں کے حق میں نعمت ثابت ہوئی۔ یہاں اہل علم، اہل ہنر، علماء ،فضلاء، شعراء وادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انھیں انعام واکرام سے نوازا گیا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کا معیاری مرکز علی گڑھ ہی تھا۔ پورے ہندوستان سے صاحب حیثیت والدین اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ روانہ کرتے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حیدرآباد دکن میں حاصل ہونے لگے۔ فرمانروانے دکن شعروادب کے دلدادہ تھے۔ حیدرآباد دکن اپنی روایاتِ علم وادب کے واسطے سے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ حیدرآباد دکن علم وفن وشعرو شاعری کا مرکز، ملکی اور غیر ملکی ہر قسم کے شعراء اور اہل کمال کا ملجا و ماوا سمجھا نے لگا۔ نظام الملک آصف جاہ اول سے لے کر آصفیہ حکومت کے تمام حکمران شعروادب کے قدردان و مربی تھے۔

مہاراجہ چندو لال شاداں، راجہ گردھاری پرشاد باقی، مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اردو و فارسی کے شاعر واسکالر تھے۔ مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد منتقل کیا اور اردو نثر کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواب عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ پورا ہوا اور اردو زبان کی ترقی وترویج کا نیا باب کھل گیا۔ فانی بدایونی حیدرآباد کے اس زرین دور کا اہم حصہ رہے ہیں۔

ابتداء سے اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو دکن کے عادل شاہی وقطب شاہی شاعروں کے زمانے سے غالبؔ اور شیفتہؔ کے زمانے تک غزل ہماری شاعری کی مملکت پر قابض رہی۔ پھر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا۔ اس تحریک میں ترقی پسندانہ عناصر بھی تھے اور رجعت پسندانہ بھی۔ ہندوستان میں نئے خیالات کا دھارا بہہ نکلا۔ علم وادب اور آرٹ کے قدیم تصورات پر جدید تصورات حملہ آور ہوئے اور آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر یہ احساس پھیلتا گیا کہ شعروادب میں زندگی کے خارجی کوائف اور ٹھوس مادی و اصلی حقائق کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ یہ احساس دراصل مغربی شعروادب کی واقفیت، سلاست اور تنوع سے پیدا ہوا۔ اسی احساس کے تحت ایک طرف اردو نظم کی بنیاد پڑی تو دوسری طرف غزل کے خلاف آواز بغاوت بلند ہوئی۔ حالیؔ نے صرف غزل کو نہیں دورِ انحطاط کی ساری اردو شاعری کو جو شعرائے متاخرین کی پیداوار تھی۔ اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا تھا۔ اُس وقت اردو شاعری میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا اور شاعری کو معمارِ فن کی ضرورت تھی۔ حالیؔ کی تخریب وتعمیر سے بیمار شاعری کو یقینا فائدہ پہنچا اور ایک نئے دور صحت کا آغاز ہوا۔ غزل نے بھی اپنے جمود کو توڑ کر کچھ قدم آگے بڑھائے۔ غزل کی لطف اندوزی ومقبولیت کم ہوئی لیکن تاثیر، افادیت اور سلاست کے لحاظ سے اُس کا معیار پہلے سے اونچا ہو گیا۔ غزل کے اس نشاۃ الثانیہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو ادب وفن کے ایک صحیح تر اور صالح تر تصور کی روشنی میں بعض قدیم غزل گو شعراء مثلاً مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی قدریں دوبارہ متعین کی

گئیں اور دوسری طرف فانی بدایونی، حسرتؔ موہانی اور اقبالؔ نے غزل میں نئی معنویت، ایک نیا وزن اور ایک نئی بلاغت پیدا کر کے اُسے بیسویں صدی کے ذوق سے قریب تر کر دیا۔ اُسے ایک قیمتی جنس کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ پہلی جنگ آزادی کے ہندوستان پر کیا اثرات رونما ہوئے؟

۲۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کیا کوشش کی؟

۳۔ حیدرآباد دکن کی علم دوستی پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ اردو غزل نے کون سی ارتقائی منزلیں طے کی؟ تحریر کیجئے۔

3.4 فانی کی حیات وشخصیت

فانی کا وطن بدایوں تھا۔ تعلیم کے سلسلہ میں بریلی اور علی گڑھ میں رہے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن اپنا زیادہ وقت مشاعروں، شعروسخن کی محفلوں میں صرف کرتے رہے۔ حیاتِ فانی کی تفصیلات یوں ہے۔ شوکت علی خان نام فانی تخلص تھا۔ ۱۳؍ستمبر ۱۸۷۹ء کو بدایوں کے قصبے اسلام نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شجاعت علی خاں پولس کے تھانہ دار تھے۔ فانی کی ابتدائی تعلیم وتربیت بدایوں میں ہوئی۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد مولوی وحیداللہ خاں صاحب سے فارسی پڑھنی شروع کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بریلی کالج سے بی اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ ذریعہ معاش کے سلسلہ میں اٹاوہ، لونڈہ، لکھنؤ، آگرہ اور حیدرآباد میں رہے۔ طرز بود وباش شاہانہ تھا۔ روپیہ پس انداز کرنے کی عادت نہ تھی۔ اس وجہ سے اکثر پریشان رہتے۔ زندگی کے آخری ایام میں ریاستِ حیدرآباد کے حکمرانوں کے مرہونِ منت رہے۔

شعرگوئی کی طرف بچپن سے ہی مائل تھے۔ والد نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنا قیمتی وقت شاعری میں صرف کریں۔ بریلی کالج میں داخلہ کے ساتھ انھیں شاعری کے لئے سازگار ماحول میسر آیا۔ اس دور کی شاعری پر علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کے ادبی ماحول کے اثرات نظر آتے ہیں۔ انھیں سرسید احمد خاں اور حالیؔ سے عقیدت پیدا ہوگئی۔ بی اے میں کامیابی کے فوراً بعد قصبہ ایکری ضلع بدایوں کے زمیندار انتظار علی خاں کی صاحبزادی شاہ زمانی بیگم سے فانی کا بیاہ ہوگیا ان سے تین اولادیں ہوئی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ گریجویٹ کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ملازمت کی۔

چند سالوں میں ہی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس گونڈہ کے عہدہ پر مامور ہوئے لیکن چند مہینوں کے بعد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی زمانے میں والد نے قانون پڑھ کر وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ فانی نے علی گڑھ جا کر ایل ایل بی میں داخلہ لیا اور ہاسٹل میں مقیم ہوئے۔

محسن الملک طالب علموں کے علمی و ادبی مشاغل میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے عالم، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔ اِسی دور کے اہم نام ظفر علی خاں، عبدالحق، سید محفوظ علی، محمد علی، خوشی محمد خان ناظر، سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمن بجنوری، حسرت موہانی، سجاد علی انصاری، مہدی افادی، عظمت اللہ خاں اور اقبال سہیل کے ہیں۔ فانی پر قیام علی گڑھ کے جو ادبی اثرات پڑے ان میں غالبؔ کے بعد حسرتؔ موہانی کی ادبی شخصیت کو بہت دخل رہا ہے۔ حسرتؔ کی غزل گوئی متقدین کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ فانی اس اندازِ فکر سے بہت متاثر ہوئے۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانہ میں شاعری کی بیاض گم ہوگئی اور فانی کا دس بارہ سال کا شعری سرمایہ ضائع ہوگیا۔ اس واقعہ سے فانی شاعری سے بدظن ہوگئے۔

علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ میں وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں خوب نام اور دولت بھی کمائی۔ بدایوں میں عدالت کا قیام عمل میں آیا تو فانی لکھنؤ سے بدایوں آ گئے یہاں آنے پر والدہ کا اور پھر والد کا انتقال ہوگیا اور وکالت پر توجہ کم ہوگئی۔ یہاں سے فانی کی شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ بدایوں کے مشاعروں میں شرکت سے اُن کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اسی دور میں اپنا دیوان طبع کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی لیکن یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ جب فانی کی شہرت بڑھی تو نومشق شعراء نے فانی کا شاگرد بننا اعزاز سمجھا لیکن فانی شاگردوں کی اصلاح کے قائل نہ تھے۔ صرف مشورہ یا سرسری طور پر اصلاح فرما دیتے۔ فانی نے شاعری میں خود کسی استاد سے تلمذ حاصل نہیں کیا۔ آغازِ شاعری میں داغؔ سے اصلاح لی۔ جنھیں فانی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ چند نام اس طرح ہیں: کلیم مختار احمد سبزواری بدایونی، فنا لودی، منشی نوشہ علی خاں حاسی، تابش دہلوی، رام سروپ موج، آزاد سہارن پوری، منشی حشمت علی خان بیکس اور صدق جھانسوی۔ فانی لکھنؤ چھوڑ کر بدایوں تو آ گئے تھے لیکن لکھنؤ کی کشش دل میں باقی تھی۔ اس وقت لکھنؤ میں عزیزؔ، صفیؔ، چکبستؔ، آرزوؔ، ثاقب جیسے اساتذہ سخن اور نوجوانوں میں یاسؔ، جوشؔ، اثرؔ، جگر، آشفتہؔ، سراجؔ اور قدیر وغیرہ اکٹھا ہو گئے تھے۔ لکھنؤ میں فانی کی شاعری کو ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ کچھ ہی عرصہ میں مشاعروں کے روح رواں بن گئے۔ کم آمدنی و بڑھتے ہوئے اخراجات سے ایک بار پھر بدایوں واپس آ گئے۔ فانی کے قدردان منشی من موہن سہائے وکیل نے انھیں بریلی بلا لیا لیکن وہ بریلی میں زیادہ دن نہ رہ سکے۔ ۱۹۲۱ء میں نقیب پریس بدایوں سے دیوانِ فانی کی

اشاعت عمل میں آئی۔ بریلی سے لوٹنے کے بعد فانی نے کچھ عرصہ بدایوں میں قیام کیا اور پھر لکھنؤ چلے گئے یہاں پر ایک طوائف تفن جان سے اُن کے مراسم کا ذکر ملتا ہے۔ معاشی تنگ دستی کی وجہ سے آبائی جائیداد فروخت کردی۔ روپیہ ہاتھ میں آنے پر کلکتہ، بمبئ اور دہلی کی سیر کی۔ لکھنؤ چھوڑ کر اٹاوہ کو اپنا مستقر بنایا۔ وکالت شروع کی لیکن دلچسپی کا مرکز دوست احباب کی محفلوں میں شعر سنانا اور مشاعروں میں شرکت تھی۔ ان ہی دنوں نور جہاں نامی طوالف سے دل لگا۔ ۱۹۲۶ء میں ''باقیاتِ فانی'' کے نام سے شاعری کا دیوان شائع ہوا۔ اٹاوہ سے دل برداشتہ ہوکر آگرہ کو وکالت کے لئے آزمانے پہنچے لیکن جلد ہی حیدرآباد کا رخ کیا۔ حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد کی جانب سے بہت زیادہ قدر دانی اور عزت افزائی ہوئی کہ تاحیات یہ اُن کی زندگی کا قیمتی سرمایہ رہا۔ حیدرآباد ہی میں مستقل قیام کا ارادہ تھا لیکن بابو لچھمن پرشاد نے انھیں آگرہ میں وکالت کا مشورہ دیا، یہاں وکالت کے ساتھ شعر وسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہی۔ جوشؔ، جگرؔ اور یگانہؔ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ فانی کو رومانیات کے علاوہ تصوف اور فلسفہ مابعدالطبیات سے بھی دلچسپی تھی۔ فانی کے دوست ضیائے عباس ہاشمی کے توسط سے مہاراجہ گوالیار کی اتالیقی کے عہدہ کی پیشکش کی گئی لیکن فانی نے خودداری کے سبب قبول نہیں کیا۔ فانی کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ معیاری ادبی رسالہ جاری کیا جائے لہٰذا ماہنامہ ''تسنیم'' کا اجراء عمل میں آیا لیکن چند ہی مہینوں میں مجلس ادارت کے اراکین منتشر ہوگئے۔ پھر دوبارہ حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا۔ مہاراجہ نے جیب خاص سے فانی کا مشاہرہ مقرر کردیا تھا۔ فانی حیدرآباد میں ملازمت کے لئے تگ ودو کرتے رہے۔ آخر کار دارالشفا ہائی اسکول پر صدر مدرس ہوگئے۔ معاشی آسودگی ہوتے ہی احباب کی صحبتوں اور شاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ صدر مدرسی پر تقرر کے چند ماہ بعد فانی کو شہزادہ معظم جاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ معظم جاہ کا دربار سازشوں کا اکھاڑہ تھا۔ دربار میں اپنے قدم جمائے رکھنے کو فانی کو بھی زمانہ سازی اور خوشامد سے کام لینا پڑا۔ معظم جاہ فانی کے قدرداں تھے اس لئے فانی کسی مالی منفعت کا خیال کئے بغیر آخر وقت تک اس دربار سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد میں دورانِ ملازمت فانی کا تبادلہ ناندیڑ کردیا گیا، وہ حیدرآباد کی شہری زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ ناندیڑ کے دیہاتی ماحول میں اُن کا دل نہیں لگا، طویل رخصت لے لی۔

۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق کی کوششوں سے ''عرفانیات فانی'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ فانی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور اُسی عرصہ میں بیوی کا انتقال ہوگیا۔ فانی افکار ومصائب میں گرفتار ہوگئے۔ ۸ رستمبر ۱۹۴۰ء کو فانی کے شفیق محسن مہاراجہ کشن پرشاد بھی وفات پاگئے۔ فانی کو امید دلائی گئی کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی ریڈری پر اُن کا تقرر ہوجائے گا لیکن نہیں ہوسکا۔ ''وجدانیات فانی'' کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۴۰ء میں حیدرآباد سے طبع ہوا۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں

نواب حمید اللہ خان والئی بھوپال کے جشن سالگرہ کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ فانی کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ مشاعرہ ریڈیو پر نشر ہوا۔ فانی کے چاہنے والوں نے بڑی عقیدت و دلچسپی سے اُن کا کلام ریڈیو پر سنا۔ زندگی کے آخری ایام معاشی بدحالی میں گزرے۔ خودداری کی وجہ سے وہ کسی سے مدد لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ دوستوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ فانی کی صحت روز بروز گرتی گئی۔ آخر کار ۲۷/اگست ۱۹۴۱ء کو شام ۵ بجکر ۴۵ منٹ پر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ درگاہِ یوسفین حیدر آباد میں تدفین عمل میں آئی۔

فانی ایک بڑے فنکار تھے۔ ان کی شخصیت میں جینیس (Genius) کی علامتیں ملتی ہیں۔ عام زندگی میں ان کا شرمیلا پن ان کی خود اعتمادی کا مظہر تھا۔ وہ حد سے زیادہ حساس اور پُرخلوص انسان تھے۔ نوعِ انسانی کے درد و کرب کا انھیں سخت احساس تھا۔ یہی کرب و تکلیف کا اظہار اُن کی تخلیق میں بھی ہوتا ہے اور روزانہ کی زندگی میں بھی وہ خاموش اور تنہا رہنا پسند کرتے تھے۔ فانی کی زندگی میں خودداری کے پہلو بہ پہلو خودنمائی کا جذبہ کارفرما تھا۔ انھیں اپنی خاندانی شرافت و امارت کا شدید احساس تھا۔ شوکت علی خان فانی نسلاً پٹھان تھے۔ شجاعت، خودداری، آزادی پسندی، مذہبی رواداری، کشادہ مزاجی پٹھانوں کی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ وہیں ان کے مزاج کی سیمابیت، مہم جوئی، انتہاپسندی، جذباتیت، ظلم، بے رحمی، بے وفائی، جذبۂ انتقام جیسی صفات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ فانی کا نام کیا تھا وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ فانی کی تعلیم کہاں ہوئی؟

۳۔ فانی بدایونی نے کون کون سے مقامات کے مشاعروں میں شرکت کی؟

۴۔ فانی بدایونی کی زندگی کے آخری ایام کس طرح گزرے؟

3.5 فانی بدایونی کی ادبی خدمات

فانی بدایونی غزل گوشاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ غزلیات کے علاوہ موقع ومحل کی مناسبت سے رباعیات اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔غزل گوئی کے علاوہ اُن کی دیگر ادبی خدمات کا جائزہ اس حصہ میں پیش کیا جارہا ہے۔فانی کی شاعری کا کل زمانہ نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔اس تمام عرصے میں فانی کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے:

(۱)	دیوانِ فانی	۱۹۲۱ء	نقیب پریس بدایونی
(۲)	باقیاتِ فانی	۱۹۲۶ء	آگرہ اخبار پریس آگرہ
(۳)	عرفانیاتِ فانی	۱۹۳۹ء	لطیفی پریس دہلی
(۴)	وجدانیاتِ فانی	۱۹۴۰ء	مطبع دارلکتاب حیدرآباد

فانی نے اردواور فارسی کے اساتذۂ سخن کے دواوین کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔فن شاعری کی تربیت میں اِس مطالعہ کا اہم حصہ رہا ہے۔اپنی شاعری کے آغاز میں وہ شعرائے رام پور بالخصوص داغؔ اور امیرؔ کے علاوہ دبستانِ ناسخ کے شعراء سے زیادہ متاثر رہے۔انھیں ابتداء میں صنائع کے استعمال کا خاص شوق رہا ہے۔فانی فن کی تخلیقی اہمیت سے واقف تھے اور شاعری کو انفرادی احساسات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔زبان کے بنے بنائے معیار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اظہار کے لئے اپنی زبان آپ بنانا جانتے تھے۔فانی نے روزمرہ اور محاورہ کی صحت کا ہر ممکنہ خیال رکھا۔ صنائع وبدائع سے شعر کے ظاہری تزئین بھی کی لیکن ان چیزوں کو مقصود شاعری نہیں بنایا۔شعر کے لئے شعریت ہی ان کا واحد معیار تھا۔انھوں نے جگہ جگہ خوبصورتی کے ساتھ تشبیہ، استعارے، کنایے اور علائم کا استعمال کیا ہے، اس لئے اُن کی شاعری میں حیرت انگیز لطافت اور موسیقی پیدا ہوگئی ہے۔

فانی بدایونی کے والد اُن کی شاعری کے خلاف تھے۔فانی کی ابتدائی شاعری جس بیاض میں تھی والد نے اُسے ضائع کردیا۔فانی کو اس کا بہت صدمہ تھا۔بریلی کالج میں داخلے کے بعد اُن کو شاعری کے لئے نیا ماحول ملا۔اِسی سال کالج میں تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔فانی نے اس موقع پر ایک قصیدہ ترکیب بند کی صورت میں لکھ کر جلسہ میں سنایا۔اکتوبر ۱۹۰۲ء کو علی گڑھ کالج میں انجمن اردوئے معلّٰی کا سالانہ جلسہ شاندار پیمانے پر منقد ہوا۔فانی نے اس موقع پر اردو زبان کے بارے میں ایک عمدہ نظم تحریر کی اور سنائی۔ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے ابتدائی دور سے ہی وہ

غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

ابتدائی عمر سے لےکر زندگی کے آخری حصہ تک وہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے اور خوب داد حاصل کی اور بھرپور شہرت کمائی۔ کالج کے زمانے میں ہی انھوں نے شیکسپیئر کے طربیہ ڈرامے (Much Ado about Nothing) اور ملٹن کی نظم Comus کو اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ ترجمے شائع نہ ہوسکے۔ علی گڑھ کالج سے ہی شاعر کی حیثیت سے انھیں شہرت مل گئی تھی۔ بڑے بڑے جلسوں میں انھیں کلام پیش کرنے کا موقع ملا۔

جنوری ۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں والئی افغانستان، علی گڑھ کالج کے معائنہ کے لئے آئے۔ اس موقع پر فانی نے ایک فارسی قصیدہ امیر کی شان میں پڑھا تھا۔ علی گڑھ کالج میں آزادی نسواں کی تحریک نئی نئی شروع ہوئی تو فانی نے اِس موضوع پر رباعیات قلمبند کی ہیں۔

پردہ کہ عرب سے لے کے تار دم و عجم
کچھ شرم و حیا سے اس میں زیادہ تھا نہ کم
کایا سی گئی ہند میں کچھ اس کی پلٹ
یاں اس نے لیا ہے اینٹ گارے کا جنم

☆

محکوم ہے حاکم کی حکومت کا شکار
کمزور زبردست کی قوت کا شکار
تھوڑی ہے نہ ہو جو عورتوں پر سختی
جب تک ہیں یہ مردوں کی جہالت کا شکار

فانی کو تاریخی قطعات لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ دیوان طبع کرانے کا خیال پیدا ہوا تو قطعہ تاریخ کہہ لیا تھا اور ''نغمہ جگہ دوز'' / ۱۳۳۵ھ سے تاریخ نکالی تھی۔ فانی کو پڑھنے لکھنے اور زبان وادب سے دلچسپی تھی۔ وکالت کا پیشہ اُن کے مزاج کے مطابق تھا۔ آگرہ کے احباب نے مشورہ دیا کہ معیاری ادبی رسالہ جاری کریں۔ یہ کام ادبی ذوق کی تسکین کا باعث بھی ہوگا اور آمدنی کا ذریعہ بھی۔ لہٰذا ایک رسالہ ماہنامہ ''تسنیم'' آگرہ سے جاری کیا گیا۔ فانی اس کے مدیر اعلیٰ تھے۔ اُن کا لکھا ہوا اداریہ ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُن کی نثر میں بھی وہی فنکاری اور نوک پلک نظر آتی ہے جو اُن کی شاعرانہ خوبی ہے:

’’میدانِ عمل کے نشیب و فراز میں امید و بیم کے منازل طے کئے، قدم بڑھا اور ٹھیرا، ٹھیرا اور بڑھا کبھی خیال میں عمل اور کبھی عمل میں خیالِ محض نظر آتا تھا۔‘‘

(اداریہ ماہنامہ ’تسنیم‘ جنوری ۱۹۳۱ء ص ۴۔۳)

غزل گوئی اُن کے قلم کا جوہر خاص تھا لیکن اکثر غزل کے علاوہ دیگر تخلیقات سے انھوں نے قارئین کو متوجہ کیا ہے۔ آگرہ کے دوست حافظ امام الدین کے نام لکھا ہوا منظوم خط بھی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

مشفق و مہرباں جناب امام	خط ملا بعد انتظارِ تمام
خط کے ہمراہ ‘ یہ پیام بھی تھا	یاد ہے دوستوں کو تیرا نام

جوش اُن کے بہترین ساتھیوں میں تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ غصہ کا اظہار دونوں نے رباعیاں لکھ کر کیا۔ اُسی موقع کی ایک رباعی اسی طرح ہے۔

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے	بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے
ورنہ تو وہ دوستوں نے ایذا دی ہے	شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہتے

بیوی کی موت سے زندگی سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ اُسی وقت فارسی کا قطعہ تاریخ لکھا اور دوستوں سے کہا کہ میری موت کی تاریخ ہے۔

اُو از جہان گزشت کہ آخر خدا نبود
اُو این چنین بزیست کہ گویا خدا انداشت
طغیانِ نازبین کہ بہ نوحِ مزارِ اُو
ثبت است سالِ رحلت فانی خدا نداشت
۱۳۶۰ھ

مہاراجہ سرکشن پرشاد کی وفات پر قطعۂ تعزیت سے اُن کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اب کہاں رسمِ مروّت اور کہاں ہندوستاں
آج بھی باقی یہاں رسم مروّت تجھ سے تھی

فانی بدایونی کا حیدرآباد سے ناندیڑ تبادلہ کر دیا گیا، وہاں کے دیہاتی ماحول اور تنہائی سے بیزار ہو گئے اور اپنے

جذبات کو اِس طرح پیش کیا ہے۔

سرگذشتِ غم تنہائی نا ندیڑ نہ پوچھ میں وہاں ہوں کہ جہاں میں بھی ہوں کچھ آپ سے دور
جس طرف دیکھئے اک عالمِ ہو کی تصویر جس طرف جایئے وحشت سے فضائیں معمور

غزل گوئی کے علاوہ اُن کی شاعرانہ جذبات کے نمونے اردو و فارسی کے رباعیات، قصیدے اور دلچسپ وسادہ نظموں میں ملتے ہیں۔ کل ہند مشاعروں میں اُن کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ مدعو کیا جاتا تھا۔ ریاستِ حیدرآباد کا خصوصی نمائندے بنا کر جے پور کے کل ہند مشاعرے میں شرکت کی۔ اِس طرح جنوری ۱۹۴۱ء میں نواب حمیداللہ خاں والی بھوپال کے جشنِ سالگرہ کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا۔ فانی بدایوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ادبی خدمات کا اعتراف اور قدردانی اُن کی زندگی میں ہوئی۔ ادب کے موضوعات پر اُن کے مضامین ریڈیو سے بھی نشر کئے جاتے تھے۔ ایک خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں ریڈیو کے انتظامیہ کی جانب سے ''غزل اور اُس کے لوازم'' اس موضوع پر تقریر کرنے مدعو کیا گیا تھا۔ فانی نے خط میں تاریخ اور موضوع بدلنے کی درخواست کی ہے۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح اور مفید مشوروں کو بھی اُن کی ادبی خدمات میں شامل کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

<u>اپنے مطالعے کی جانچ</u>

۱۔ فانی کے مجموعۂ کلام کے نام بہ اعتبار سن لکھئے۔

۲۔ بریلی کالج اور علی گڑھ کالج کے جلسوں میں کون سی شاعرانہ تخلیقات پیش کیں؟

۳۔ فانی بدایونی کے نثر کے نمونے کون سے ہیں؟

۴۔ قطعہ تاریخ انھوں نے کون سے موقع پر لکھئے؟

3.6 فانی بدایونی کی غزل گوئی

فانی کے فکر و فن کا سارا سرمایہ اُن کی غزلوں میں محفوظ ہے۔ فانی کے کلام میں شروع سے آخر تک حزن کی لہریں ملتی ہیں۔ وہ غمگین اور اذیت پسند شاعر نظر آتے ہیں۔ اُن کی غمگینی اور اذیت پسندی کے اسباب اُن کی زندگی و شخصیت میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ فانی اپنی زندگی میں ناکامیوں سے دوچار ہوئے۔ اُن کی مادی، جنسی اور رومانی زندگی شدید

طور پر متاثر ہوئی۔ معاشی زندگی مستحکم نہ تھی جس کی وجہ غیر یقینی مستقبل کے خیال سے انھیں اطمینان میسر نہ آیا۔ اُن کے غم کا ایک سبب جنسی محرومی بھی رہا۔ جنسی نا آسودگی کا اظہار اُن کی غزلوں میں ملتا ہے۔ فانی ان دنیاوی خوشیوں اور مسرتوں کی نفی کرتے ہیں جو خود انھیں حاصل نہیں ہوسکیں۔ وہ اس غم سے بھی نفرت کرتے ہیں جس کی بنیاد خواہش پر ہو۔ فانی ایک طرف اپنے آلام پر آنسو بہاتے اور بدنصیبی کا گلہ کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیاوی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی شدید خواہش اُن کے دل میں تھی۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

زندگی کی ناپائیداری کا احساس فانی کے کلام میں جا بجا جھلکتا ہے۔ بے دلی اور دنیا سے بیزارگی کی کیفیت کے پیچھے غم واندوہ کا طوفان نظر آتا ہے۔

دنیا میری بلا جائے ، منگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

اُن کے اشعار میں زندگی کا کرب اور المنا کی تو ہے لیکن شدید نغمگی و رعنائی متاثر کن ہے۔ زندگی کے کرب' اس کی سفا کی اور المنا کی کی لذت سے اُن کو اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ زندگی کی مسرتوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ فانی کی غزلوں میں جو خارجی و داخلی غم ملتا ہے اس کا تعلق ان کے قنوطی رجحان اور اندازِ فکر سے ہے۔ جگہ جگہ الام کی شدت سے ان کی شاعری میں ایک قسم کا گداز ابھرتا ہے کہ پڑھنے والے بھی اپنے آپ کو حزن و یاس اور رنج والم کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ ساری زندگی معاشی خاندانی اور جنسی الجھنوں میں گرفتار رہے لیکن اس ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے کسی کا سہارا لینا پسند نہیں کیا۔ زندگی کا یہی زہر اُن کی شاعری میں لفظوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ موت، شکستِ آرزو اور وفور کرب کی تمنا اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے گزرے بغیر ایک ابدی اور لازوال مسرت کا حصول ناممکن ہے۔ یہ حصول مسرت کا جذبہ ہی ہے جو انھیں زندگی کے غموں کو جھیلنے کے لئے یک گونہ جرأت رندانہ عطا کر دیتا ہے۔ زیست کی محرومیوں کا خلاصہ اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے۔

مال افرونی شکل ہے ہر آسانی کار
میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا

جب انھیں کامل یقین ہو جاتا ہے حیات کی مجبوریاں اُن کا مقدر ہے وہ موت کے لئے دستِ دعا دراز کرتے ہیں۔

تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام
الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہوجائے

فانی نے غمِ ہستی کی اصطلاح غمِ ذات اور غمِ دنیا دونوں سے وسیع تر مفہوم میں استعمال کی ہے۔ زندگی کی ناپائیداری اور بے مقصدیت کا احساس اور بقا کی خواہش اس غم کی اساس ہے۔ فانی کے یہاں چونکہ عقیدۂ جبر پر زیادہ اصرار ملتا ہے اس لئے ان کے یہاں غم کا جو تصور ابھرتا ہے وہ اس قدر مستحکم ہے جس کا خاتمہ زندگی کے ساتھ ہے۔

ہوتا ہے جو وہ ہو کے رہے گا مجبوری کی حد سے نہ بڑھ
بیٹھے بٹھائے اپنے سر آزادی کا الزام نہ ملے

فانی ساری عمر کسی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن بدقسمتی سے وہ اس حقیقت کو نہ پا سکے۔ حالانکہ انھیں اس میں جن جن صعوبتوں سے گزرنا پڑا اس کا ذکر کرنا محال ہے۔

ماورائے حد منزل ہے شاید کوئے دوست
ہم نے جو چھانی نہ ہو ایسی کوئی منزل نہیں

فانی کا ذوقِ جمال بے حد ارفع، شائستہ اور نکھرا ہوا تھا۔ حسن ان کے نزدیک دیکھنے، چھونے اور لطف اندوز ہونے کی چیز ہے۔ ان کے کلام میں حسن کی محاکات زیادہ تر بصری ہیں۔ اس میں تحرک اور ارتکاش ہے۔ شعر کے صوتی نغمے پر آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دینے والی یہ تصویریں رقص و نغمے کی محفل سجا دیتی ہیں۔

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی سی
دیکھیں خرام نازکی محشر طرازیاں
ہر ذرہ پُرسکون فنا بے قرار ہے

اردو غزل میں زبان کے استعمال کے طریقے ہر زمانے میں تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ہر بڑے شاعر نے الفاظ کو برتنے کا ایک نیا سلیقہ پیش کیا ہے۔ فانی کے یہاں غزل کی نئی زبان کا بہت زیادہ احساس نہیں ملتا۔ البتہ انھوں نے ندرت مختلف شعراء کے اسالیب کی پیوندکاری سے پیدا کی ہے۔ فانی کی زبان پابند روایات ہوتے ہوئے بھی اظہار کا مخصوص پیرایہ رکھتی ہے۔

فانی نے استبعادی زبان کو اپنے اظہار کا جز و بیان تھا۔ استبعاد ایسا دعویٰ یا رویہ ہوتا ہے جو بظاہر فہم عامہ سے بعید

ہو یا خلاف معلوم ہو لیکن غور کرنے پر اس کی صداقت ظاہر ہو جائے۔ یہ ایک ادبی صفت ہے اس میں بیاں کے ظاہری تضاد کے ذریعہ سچائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ فانی کی استبعادی زبان ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ فانی کی سماجی خود آزاد شخصیت نے اِسے مدافعت اور حملے کا ہتھیار بنالیا تھا۔ فانی کی استبعادی زبان، ان کے طرز فکر اور زاویۂ نظر سے خاص موافقت رکھتی ہے۔ انھیں روشِ عام پر چلنا گذارا نہ تھا۔

فانی کے اظہار کا ایک اہم وصف ڈرامائیت ہے جو حرکی و بصری محاکات، تشخص اور مکالموں سے تشکیل پاتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت ان اشعار میں زیادہ نمایاں ہے جن میں یہ تمام چیزیں یکجا ہو گئی ہیں۔

دیکھ ! دل کی زمین لرزتی ہے　　یاد جاناں قدم سنبھال اپنا

اس شعر میں ڈرامائی کیفیت ہے کیونکہ شعر پڑھنے کے ساتھ ہی ہماری توجہ ایک عمل پر مرکوز ہوتی ہے۔ فانی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات محسوس ہوتی ہے جیسے ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہر کیفیت کو جسم اور ہر بے جان شئے کو زندگی مل گئی ہے۔ زندگی ہمیں چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہے۔ ہم فانی کا شعر محسوس بھی کرتے ہیں۔

فانی کی شاعری کا بڑا حصہ مکالماتی زبان ہے۔ ڈرامائی مکالمے کا اطلاق ایسے شعر پر ہو سکتا ہے جس میں مکالماتی فقرے ڈرامائی عمل کے ساتھ مربوط ہیں۔

کیا بلا تھی ادائے پرسشِ یار　　مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

دو گھڑی کے لئے میزان عدالت ٹھیرے　　کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

خالص عشقیہ اور غنائی شاعری میں خطاب خواہ کسی سے ہو، اصل تخاطب محبوب سے ہوتا ہے۔ یا شاعر کا مخاطب خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وہ قاری کو اپنے احوال کا راز داں بنالیتا ہے۔ مکالماتی زبان کو فانی نے جذبات کا مؤثر اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مکالمے سے فانی کے کلام میں داخلی محاکات پیدا ہوتی ہے۔

کچھ شغل چاہیئے جو نظر کو تو پھر حضور
دل چاک ہوگیا ہے اسی کو رفو کریں
ناخوشگوار ہے جو محبت کا تذکرہ
اچھا تو لاؤ اور کوئی گفتگو کریں

شعر کی ہیئت میں اصوات کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ شعر کی خارجی موسیقی اصوات ہی کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتی ہے۔ ہر ادب پارہ سب سے پہلے اصوات کا سلسلہ ہوتا ہے جس سے معانی ابھرتے ہیں۔ شعر کے آہنگ کی

تشکیل میں اصوات، بحر اور ردیف وقوافی اجتماعی طور پر حصہ لیتے ہیں۔ فانی بدایونی نے اپنی غزلوں میں معنی ومفہوم کے اعتبار سے بحر کا انتخاب کیا ہے اور ردیف وقوافی بھی منتخب کی ہیں۔ اُن کی غزلیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔

3.6.1 فانی بدایونی کی منتخب غزلوں کی تشریح

غزل (۱)

(۱) ہل گیا زنداں برا ہو نالۂ شب گیر کا
چونک اٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

فانی بدایونی کی تمام عمر غم والم میں گزری اور یہی غم گینی کی کیفیت اُن کے اشعار میں نمایاں ہے۔ شاعر غم، عشق اور غم حیات میں مبتلا ہے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے زنداں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غمگین اور اداس راتوں میں ایسی آہ وفریاد دل سے نکلی کہ اُس کی تاثیر سے زنداں کی در و دیوار ہل گئی اور میری زنجیر کی ہر کڑی گھبرا کر چونک اٹھی۔ اس شعر میں زنداں سے مراد زندگی اور زنجیر سے مراد غموں کا تسلسل بھی لیا جا سکتا ہے۔

(۲) میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

فانی بدایونی کو ساری عمر اپنی تقدیر سے شکایت رہی۔ زندگی کی جن سہولتوں اور خوشیوں کے وہ خواہشمند تھے وہ انھیں حاصل نہ ہوسکی۔ معاشی تنگ دستی وجنسی محرومی کا وہ شکار رہے۔ تدبیریں تو انھوں نے بہت کی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس شعر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ یارب تو مشکلوں کو آسان فرما، میں تدبیر تو کئے جا رہا ہوں، کیا میری تدبیروں کی قسمت میں صرف منہ تکنا لکھا ہے۔ منہ تکنا محاورہ ہے۔ مفہوم ہے کسی کام کے لئے کسی کی جانب پُر امید نظروں سے دیکھنا۔ کہتے ہیں کہ میری تدبیریں تقدیر کو پُر امید نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن مقصد کا حصول نظر نہیں آتا۔

(۳) میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہ خلش
یاد ہے گم ہوگیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

فانی بدایونی کے اس شعر میں بھی وہی بے چینی و بے قراری کا احساس ہے جو اُن کے دیگر اشعار میں نمایاں ہے۔ انھیں زندگی بھر سکون و اطمینان میسر نہیں آیا اور ایک خلش سی محسوس کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ آپ میرے دل سے خلش کی وجہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک تیر میرے دل میں پیوست ہوا تھا اور اسی تیر کی وجہ سے خلش محسوس کر رہا ہوں۔ یہ غم عشق کا تیر بھی ہوسکتا ہے اور غم روزگار کا، زندگی میں کوئی چیز کھو جائے یا کوئی محرومی کا احساس ستا تا رہے تو اضطراب و بے چینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

(۴) عشق کا بھی کیا تصرف ہے کہ دل اب دل نہیں
آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

غمگین دل کی کیفیت کا اظہار ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا دل اب دل نہیں رہا، دل پر عشق کا تصرف ہوگیا ہے۔ دل پر عشق کی کیفیت اس قدر چھائی ہے کہ دل اُسی میں جکڑ گیا ہے اور عشق کے نتیجہ میں غم کی جیتی جاگتی تصویر بن گیا ہے۔ دل گویا ایسا آئینہ ہے جس میں غم کی تصویر واضح نظر آ رہی ہے۔ کہنا یہی مقصود ہے کہ عشق کی ناکامی کی وجہ سے دل غمگین واُداس ہے۔

(۵) آپ کی آزردگی بے سبب بھی خوب ہے
کیا مزے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا

اپنے محبوب سے مخاطب ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بے سبب یا بلا وجہ مجھ سے ناراض ہیں۔ آپ کی خفگی بھی بڑی خوب ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں، میں بے گناہ ہوں اور آپ مجھ سے ناراضگی لئے بیٹھے ہیں۔ میری بے گناہی کا عذر یہ ہے کہ آپ بے سبب مجھ سے ناراض ہیں۔ محبوب سے شکوہ، شکایتیں، روٹھنا، منانا، اُن کی شاعری کا دلچسپ موضوع ہے۔

(۶)(۶) برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

فانی تمام غزلیات میں اپنی تقدیر سے شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ برق نے میرے خرمن کو آگ لگا

دی اور میری تقدیر سے اس میں جو کچھ بھی میرا اثاثہ تھا جل کر خاک ہوگیا۔ برق نے اپنا کام انجام دے دیا۔ اب اُس کو کیا غرض کہ میرا کیا جل گیا اور کیا جلنے سے رہ گیا۔ در پردہ دنیا کی سرد مہری اور خودغرضی پر طنز ہے اور اپنی بدبختی کا افسوس ہے۔

(۷) فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

فانی بدایونی نے تقدیر اور تدبیر کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کی کوئی بھی نعمت قسمت میں ہوتو حاصل ہو جاتی ہے۔ صرف تدبیر سے ہی مقصد حاصل نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص مقصد کے حصول کی صرف فکر کرتا رہے تو بے سود ہے۔ قسمت اور تقدیر اصل شئے ہے۔ تقدیر میں ہوتو تدبیر کی راہ بھی مل جاتی ہے۔

(۸) نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

اس شعر میں شاعر (فانی) نے حددرجہ مایوسی و ناکامی کا اظہار کیا ہے۔ غموں اور تکلیفوں میں مبتلا ہوکر آہیں بلند کرتے ہیں لیکن یہ آہیں اتنی بے تاثیر اور بے اثر ہے دوسرے شخص پر اس کا مطلق یا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا ایک ایک سانس بے تاثیر آہوں کا جنازہ ہے۔ شاعر کا اپنے بارے میں خیال ہے کہ نامرادی و ناکامی حد سے زیادہ ہوگئی ہے۔ حال بہت برا ہے۔ اس بارے میں کچھ نہ پوچھنا ہی اچھا ہے۔

☆

غزل(۲)

(۱) ہم' موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے
مجبورِ غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے

فانی بدایونی کی غزلوں کا موضوع غم' حزن و یاس ہے۔ اکثر اشعار میں انھوں نے اپنی غمگین کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم غموں سے اتنے بھی مجبور نہیں ہیں کہ موت آ جائے تو خوش ہو جائیں اور اُسے گلے لگا لیں تا کہ غموں سے چھٹکارا مل جائے۔ غمگین، نامرادو ناکام افراد موت کا انتظار کرتے ہیں اور موت کو زندگی کی مجبوری کا مداوا سمجھتے ہیں۔ فانی کے اکثر اشعار کا موضوع موت ہے۔

(۲) دل ہی میں نہیں رہتے، آنکھوں میں بھی رہتے ہو
تم دور بھی رہتے ہو تو دور نہیں ہوتے

خالص عشقیہ شعر ہے۔ شاعر اپنے محبوب و معشوق سے مخاطب ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ دل میں تو تم بسے ہوئے ہو ہی، آنکھوں میں بھی تمہاری شبیہ ہمیشہ رہتی ہے۔ یوں تو تم ہم سے دور رہتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تم دل سے دور ہو، نہ نظروں سے دور ہو۔ محبوب سے حد درجہ لگاؤ و الفت کی وجہ سے شاعر محبوب کو ہر وقت نہایت قریب محسوس کرتا ہے۔

(۳) پڑتی ہیں ابھی دل پر شرمائی ہوئی نظریں
جو وار وہ کرتے ہیں بھرپور نہیں کرتے

شاعر (فانی بدایونی) اپنے معشوق کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ اُن کی نظریں میرے دل پر پڑتی ہیں اور نظروں میں شرم ہوتی ہے۔ عشق کا وار تو وہ کرتے ہیں لیکن یہ بھرپور نہیں ہوتا۔ اُن کی نظروں میں ایسی قوت ہونی چاہئے کہ عاشق تڑپ اٹھے، گھائل ہو جائے لیکن شرماتی ہوئی نظروں میں وار کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔

(۴) امید کے وعدوں سے جی کچھ تو بہلتا تھا
اب یہ بھی ترے غم کو منظور نہیں ہوتے

عشق کے ابتدائی دور میں شاعر کی کیفیت یہ تھی کہ اگر ملاقات کا وعدہ کیا جائے تو دل بہل جاتا تھا چاہے وعدہ جھوٹا

ہی کیوں نہ ہو، اس امید پر بھروسہ ہوتا ہے لیکن اب رفتہ رفتہ دل اتنا غمگین ہو گیا ہے اور وعدوں کا بھروسہ نہیں رہا۔ ساری امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ امید کہ سہارے انتظار کے لمحات گذر جاتے ہیں۔ اب مایوسی کی کیفیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب جھوٹی امیدیں اور جھوٹے وعدے دل نہیں بہلا سکتے۔

(۵) ارباب محبت پر ، تم ظلم کے بانی ہو
یہ ورنہ محبت کے دستور نہیں ہوتے

فانی بدایونی اپنے معشوق سے شکایت کر رہے ہیں کہ محبت کا دستور یہ نہیں ہے کہ عاشق پر ظلم کیا جائے۔ اُس کے عشق کا امتحان لیا جائے، وفاداری کو پرکھا جائے، یہ محبت کے دستور کے خلاف ہے۔ تم نے تو محبت کرنے والوں میں ظلم کی بنیاد ڈال دی ہے۔

(۶) کونین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور اُن کا
اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

غزل کے تمام اشعار عشقیہ ہیں۔ اردو غزل میں معشوق اور محبوب کو مغرور بتایا گیا ہے۔ معشوق حسین ہوتا ہے اُسے اپنے حسن پر انتہا درجہ کا غرور ہوتا ہے۔ عاشقوں کی چاہت اُسے زیادہ مغرور بنا دیتی ہے، یہاں بھی وہ معاملہ ہے۔ فانی کہہ رہے ہیں کہ اُن کا غرور دونوں دنیاؤں پر بھاری ہے۔ میں نے ان کے علاوہ اور بھی حسین اور دلکش اداوالوں کو دیکھا ہے لیکن اُن کا غرور انتہا درجے کو پہنچا ہوا نہیں ہے۔ کوئی بات خلافِ توقع ہو یا تعجب میں مبتلا کر دے تو یا اللہ کہا جاتا ہے یا اللہ رے بھی کہتے ہیں فانی نے اُسی لہجے میں اپنی بات کہی ہے۔

(۷) ہے عشق ترا فانی تشہیر بھی شہرت بھی
رسوائے محبت یوں مشہور نہیں ہوتے

یہ شعر غزل میں مقطع کا شعر ہے۔ شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے فانی تیرے عشق کی شہرت ہو گئی ہے زیادہ تر لوگ یہ جان گئے ہیں کہ تو مرضِ عشق میں مبتلا ہے، یہ رسوائی و بدنامی کی بات ہے۔ محبت کی رسوائی میں اس طرح مشہور ہو جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات تو راز میں رکھی جاتی ہے، چھپائی جاتی ہے۔ پوشیدہ رکھی جانے والی کی شہرت ہو گئی ہے۔

3.7 خلاصہ

اس اکائی میں اردو کے اہم غزل گو شاعر فانی بدایونی کے عہد، حیات وشخصیت، ادبی خدمات اورغزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بی اے سال دوم کے طلبہ کے لئے یہ مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس میں فانی بدایونی کی غزلوں کے اشعار کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے اور مختصر و تفصیلی سوالات ہیں۔ فانی بدایونی نے جس دور میں آنکھیں کھولی اُس دور میں پہلی جنگ آزادی کے تباہ کن اثرات نمایاں تھے۔ اُن کے خاندان کی جاہ وحشمت و دولت بھی لٹ چکی تھی۔ سرسید احمد خاں کی تحریک کی بدولت فانی نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ حالؔی کی اصلاحی شاعری کے تحت اُن کی غزلیات میں نیاانداز و نیا رجحان نظر آتا ہے۔ اُس دور میں مسلمانوں کی امیدوں کا واحد مرکز حیدرآباد کی سلطنت آصفیہ تھی۔ دیگر نوجوانوں کی طرح فانی نے بھی حیدرآباد کا رخ کیا۔ لکھنؤ، آگرہ میں شعروسخن کی محفلوں اور مشاعروں میں شہرت حاصل کی۔

فانی بدایونی کا نام شوکت علی خاں تھا۔ فانی تخلص اور بدایوں آبائی وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت بدایوں میں حاصل کی۔ بریلی کالج سے بی اے اور علی گڑھ کالج سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا لیکن والد صاحب اس کے خلاف تھے۔ علی گڑھ کالج اور لکھنؤ کے مشاعروں میں اُن کا ذوق پروان چڑھا۔ ابتدائی زمانہ میں کامیاب وکالت کی، لیکن شعروسخن کی محفلوں کی وجہ سے وکالت سے توجہ ہٹ گئی۔ معاشی مسائل درپیش تھے۔ آبائی وطن بدایوں واپس آ گئے۔ والدین کا انتقال ہوا۔ خاندانی جائیداد فروخت کی۔ تلاش معاش کے لئے لکھنؤ، اٹاوہ، بریلی، آگرہ گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ یہاں اُن کی شاعری بہت قدردانی ہوئی۔ شہزادہ معظم جاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی عنایتیں بھی جاری رہیں۔ حیدرآباد میں ہی زندگی کی آخری سانس لی اور درگاہ یوسفین میں تدفین عمل میں آئی۔ والدین کی وضع داری، پاس داری، امارت، خاندانی وقار اور نسلی جاہ وجلال نے انھیں زندگی کے بد سے بدتر مرحلے میں بھی کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے باز رکھا۔ وہ ساری زندگی گوناگوں معاشی، خاندانی اور جنسی الجھنوں میں گرفتار رہے لیکن اس ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے انھوں نے کسی کا سہارا لینا پسند نہیں کیا۔ یہی درد اُن کی شاعری میں جھلکتا ہے۔

فانی بدایونی کی شاعری کا سرمایہ غزلوں میں محفوظ ہے لیکن انھوں نے وقتاً فوقتاً فارسی قطعات، رباعیات، تاریخی قطعے اور ہلکی پھلکی نظمیں بھی لکھی۔ جلسوں میں مہمان خصوصی کے استقبال میں قصیدے بھی تحریر کئے۔ فانی نے انگریزی نظموں کے اردو ترجمے بھی کئے۔ اس طرح اُن کی غزلوں کے انگریزی ترجمے بھی کئے گئے ہیں۔

فانی کی غزل گوئی کا موضوع غم، حزن ویاس ہے اور یہ اُن کی زندگی سے متاثر ہے۔ اُن کی طبیعت میں خودداری تھی۔ جذبۂ انانیت اور نرگسیت کے سبب ان کی زندگی میں سا کیت (Mosochism) کے تصور کو راہ ملی۔ انھوں نے غمِ حیات کو فلسفہ کی صورت دی۔ نغمگی و رعنائی اُن کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لہجہ میں استحکام اور یک رنگی ہے۔ پوری شاعری میں ایک ہی آہنگ ہے۔ فانی، حسرتؔ، جگر، اصغرؔ کو نئی غزل کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ فانی بدایونی کے مجموعہ کلام کے نام لکھئے اور بتایئے کہ وہ کہاں سے کب شائع ہوئے؟

۲۔ فانی بدایونی کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالئے۔

۳۔ فانی بدایونی کے عہد کا مختصر جائزہ لیجئے؟

۴۔ فانی بدایونی کی ابتدائی زندگی کیسی گزری؟ لکھئے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ فانی بدایونی کی شاعری کس طرح پروان چڑھی؟ مختلف ادوار پیش کیجئے۔

۲۔ فانی بدایونی کی غزلیات کے موضوع واسلوب کا تنقیدی محاکمہ کیجئے۔

۳۔ فانی بدایونی کی غزل گوئی پر تبصرہ کیجئے؟

۴۔ فانی بدایونی کا ادبی درجہ متعین کیجئے؟

۵۔ اردو غزل کے ارتقائی سفر میں فانی بدایونی کی اہمیت واضح کیجئے؟

(ج) درج ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

(i) ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا — دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا

(ii) جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں — اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

(iii) اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

(iv) فانی مری لحد پہ وہ آئے کہ کس طرح — کچھ تیوروں میں شکوہ بے جا لئے ہوئے

3.9 فرہنگ

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
تحسین	تعریف، مرحبا	رباعی	چار مصرعوں والی نظم، شاعری کی ایک صنف
استواری	مضبوطی، پائیدار	قصیدہ	شاعری وہ صنف ہے جس میں کسی تعریف ہو۔
صوت	آواز	صنائع وبدائع	شاعری کی زیورات
آہنگ	نغمہ، آواز	تہنیتی	مبارک بادی یا استقبالیہ
ساحرانہ	جادوئی	حزن	رنج، ملال، غم
فارغ البالی	خوش حال، مطمئن، آسودہ	گلہ	شکوہ، شکایت
انحطاط	زوال	قنوطی	ناامید، مایوس
افادی	فائدہ مند	محاکات	باہمی بات چیت، کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا
ترویج	اشاعت کرنا	حسن	خوبصورتی
رجعت	سابقہ حالت	شناسی	تمیز کرنا، پہچاننا، جاننا
تخریب	اجڑنا، خراب ہونا	ہمہ	سارا، جملہ
نشاۃ الثانیہ	کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا	گیر	پکڑنا
صعوبت	تکلیف، مصیبت	ہمہ گیر موضوعات	تمام موضوعات

3.10 معاون کتابیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	مقام اشاعت	سن اشاعت
(۱)	اردو غزل	مرتبہ: کامل قریشی	اردو اکادمی دہلی	مارچ ۱۹۸۷ء
(۲)	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دارالمصنفین شبلی ، اکیڈمی اعظم گڑھ، یوپی	پانچواں ایڈیشن ۱۰۲۰ء
(۳)	تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	
(۴)	تاریخِ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ادارہ کتاب الشفائئ دہلی	۲۰۰۰ء
(۵)	تنقید و تفہیم	قاضی عبید الرحمن ہاشمی	کتاب دنیا، دہلی	۱۰۱۲ء
(۶)	غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	قومی کونسل برائے فروغِ اردو دہلی	۱۹۷۹ء
(۷)	فانی بدایونی : حیات ، شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر مغنی تبسم	نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد	۱۹۶۹ء

☆☆☆

اکائی: 4۔ اصغر گونڈی : عہد شخصیت اور فن

ساخت:

4.1 اغراض و مقاصد

4.2 تمہید

4.3 اصغر گونڈی کا عہد

4.4 اصغر گونڈی کی حیات و شخصیت

4.5 اصغر گونڈی کی ادبی خدمات

4.6 اصغر گونڈی کی غزل گوئی

4.6.1 اصغر گونڈی کے منتخب غزلوں کی تشریح

4.7 خلاصہ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱) اصغر گونڈی کے عہد، حیات و شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔

۲) اصغر گونڈی کی ادبی خدمات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

۳) اصغر گونڈی کی غزل گوئی سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

۴) اصغر گونڈی کی غزلوں کی تشریح کر سکیں گے۔

4.2 تمہید

اصغر کا شمار جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے فن کے ذریعہ اپنے عہد کو متاثر کیا۔ اس اکائی میں ہم اصغر گونڈی کی شخصیت اور ان کے فن پر معلومات حاصل کریں گے۔

4.3 اصغر گونڈی کا عہد

اصغر گونڈی کی پیدائش 1884ء ہے یہ وہ دور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی حالات کشمکش کے دور سے گزر رہے تھے۔ تن آسانی، عیش پسندی، تعلیم کا فقدان، اخلاقی کمزوری، عیش وعشرت کی بزم آرائیاں دولت کی فراوانی اور بے کاری مشاغل ہندوستانیوں کی زندگیوں میں سرائیت کر چکے تھے۔ اور یہی وہ چیزیں تھیں۔ جن کے ہاتھوں اردو شاعری ان ہنگامہ آرائیوں اور رنگین بیانیوں میں اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔ بدذوق شعراء نے اپنی شاعری سے ساری فضا کو آلودہ کر رکھا تھا۔ عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر شاعری کی آڑ میں انہوں نے ہر قسم کی بے اعتدانی کو جائز قرار دیا۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر خود کو اخلاق وتہذیب کی تمام پابندیوں سے بے نیاز سمجھنے لگے اور عوام کے نزدیک شاعری صرف غزل میں عاشقانہ اظہار کا نام رہ گیا تھا۔ اور شاعری کا یہ مذاق اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اچھے اور سنجیدہ شاعر بھی اس رنگ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس زمانے کی کامیاب ترین شاعری اسے سمجھی جاتی تھی جس میں عشق وہوس کا اظہار ہو۔ یہ انیسویں صدی کے اختتام کا اور بیسویں صدی کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانیوں میں وسیع النظری اور رواداری کی لہر دوڑ چکی تھی۔ اب ہندوستانیوں میں بھی زبان وادب کو لے کر بیداری ہو چکی تھی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے ادب میں مقصدیت پر زور دیا۔ سب سے پہلے مولانا حالؔی نے مفید اور سنجیدہ شاعری کا آغاز کیا۔ بیسویں صدی کے آتے آتے نئے رجحانات نے شعوری صورت اختیار کر لی۔ قوم اور ملک اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور میں اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کے سینوں میں ملت پرستی اور حرارت آفرین احساسات کو جگا رہے تھے۔

شعر وادب کے اس نئے انقلاب سے اردو غزل میں بھی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس دور میں غزل، قدیم روایات سے نکل کر اپنے جدید دور میں شامل ہوگئی۔ جدید غزل میں روایتی خیالات سے گریز کیا جانے لگا۔ وارداتِ عشق ومحبت کے علاوہ فلسفیانہ، سماجی وسیاسی افکار کی بھی ترجمانی اس میں ہونے لگی۔ حقیقت نگاری جدید غزل کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ عہد جدید کے باکمال شعراء جنہوں نے اس رنگ کو کامیابی بخشی ان میں مولانا حسرت موہانی، فانی بدایوانی، یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈی کے نام اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کس سنہ میں ہوئی ؟

۲۔ مفیداور سنجیدہ شاعری کا آغاز کس سنہ میں ہوا؟

۳۔ جدید غزل گوشعراء کون کون ہیں؟ نام بتائیے۔

4.4 اصغر گونڈ ی کی حیات وشخصیت

اصغر گونڈ ی کا شمار جدید غزل گوشعراء میں ہوتا ہے۔اصغر یکم مارچ 1884ئ میں گورکھپور کے محلہ الٰہی باغ میں پیدا ہوئے ۔ان کا پورا نام اصغر حسین تھا اور تخلص اصغر تھا۔والد کا نام منشی تفضّل حسین تھا۔منشی تفضّل حسین عربی اور فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ان کے فارسی کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔گھر میں فارسی کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔منشی تفضّل حسین قدیم مشرقی تہذیب وتمدن کا نمونہ تھے۔گورکھپور ان کا آبائی وطن تھا مگر ملازمت کے سلسلے میں گونڈہ آئے اور گونڈہ میں صدر قانون گو کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔اصغر والد کے ساتھ گونڈہ آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اصغر کا ابتدائی زمانہ گونڈہ ہی میں گذرا۔عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گونڈہ سے حاصل کی۔اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۴ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔آگے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔انٹر پڑھ رہے تھے کہ والد کی ایما پر ملازمت کی تلاش شروع کردی۔اس دوران ان کی ملاقات ریلوے کے ہیڈ کلرک بابو راج بہادر نامی سے ہوئی۔راج بہادر اصغر کے ذہن وذکاوت اور بذلہ سنجی سے کافی متاثر ہوئے اور اپنی کوششوں سے بیس روپیہ ماہوار پر اصغر کو ریلوے ٹائم کیپر مقرر کردیا۔اصغر اپنے ذاتی مطالعہ سے اردو اور فارسی میں اچھی لیاقت پیدا کرلی تھی۔ریلوے میں رہتے ہوئے وہ اپنے اینگلو انڈین افسر کی مدد سے انگریزی ادبیات سے کچھ آشنا بھی ہو گئے تھے اور اتنی قابلیت حاصل کرلی تھی کہ انگریزی کے کسی بھی مضمون کا ترجمہ اردو میں کردیتے تھے۔اصغر بڑے فرض شناس انسان تھے۔اپنے ماتحتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ان کی معمولی غلطیوں اور حاضری میں دیر سویر کو نظر انداز کردیا کرتے تھے۔وقت ضرورت ان کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ریلوے کے ملازم اصغر کی شرافت، نیک دلی اور ہمدردی سے بہت خوش تھے۔اور انھیں بابو کہہ کر بلاتے تھے۔

اصغر کی ریلوے کی ملازمت کا سلسلہ خوش اسلوبی کے ساتھ جاری وساری رہا۔اصغر اپنے مہربان بابو راج بہادر کے بے حد ممنون تھے۔انھیں اپنا محسن اور مشفق سمجھتے تھے۔راج بہادر رنگین مزاج اور تیز طرار انسان تھے۔ان کی دوستی اور صحبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر کے مزاج میں بھی رنگینی آگئی۔اور وہ بلا کی مئے نوشی کرنے لگے۔بات اور آگے بڑھی۔چھٹن

نامی طوائف سے ان کی دوستی ہوگئی۔اصغر کی مئے نوشی اور رنگین مزاجی کا سلسلہ 1907ء سے 1912ء تک چلتا رہا۔مگر خدا کو ان کی ذات سے کچھ اور ہی منظور تھا۔موسم سرما کی ایک رات وہ کنور وشوناتھ ایڈوکیٹ کے مکان پر مئے نوشی کے شغل میں مصروف تھے۔خیام کے فلسفہ شراب اور اقبال کے اسرار خودی اور رموز بیخودی پر گفتگو چھڑی۔اصغر حسبِ معمول اپنے عالمانہ انداز میں اس فلسفہ کے نکات وعوائض بیان کر رہے تھے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے طہارت نفس کو شرطِ اولین قرار دے رہے تھے۔بیان کرتے کرتے ان پر کچھ عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب سی یکا یک جاگ پڑے ہوں۔ان کے سامنے دورِ جام آ گیا۔اصغر نے نم آنکھوں سے جامِ شراب کو ہاتھوں میں اٹھا لیا اور لوگوں سے مخاطب کر کے رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔دوستو گواہ رہنا۔اصغر کا یہ آخری جام شراب ہے۔آج سے وہ مئے نوشی سے توبہ کرتا ہے۔خدا اسے معاف کرے اور اپنے عہد پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔اس واقعہ کے بعد اصغر نے پھر کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔چھٹن نامی طوائف سے با قاعدہ نکاح کر لیا۔اب وہ شریفانہ اور زاہدانہ زندگی گذارنے لگے۔اصغر شاہ عبدالغنی منگلوری سہانپوری کے مرید ہوگے۔ریلوے کی ملازمت ترک کر دی۔اصغر کی پہلی شادی شاہ پور کے قاضی خاندان میں ہوئی تھی۔اس شادی سے انھیں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ تک رہ نہ سکی اور دونوں میں علاحدگی ہوگئی۔بعد میں انھوں نے چھٹن نامی طوائف سے شادی کر لی۔اس شادی سے انھیں کوئی اولاد نہ ہوئی۔

اصغر کشیدہ قامت،سانولے رنگ،فرنچ داڑھی اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک کے ساتھ کشش رکھتے تھے۔چہرے پر متانت اور وقار نمایاں تھا۔آنکھوں پر نصف دائرے کی عینک لگاتے تھے۔لانبا کرتا،چوڑی دار پاجاما،شیروانی اور بالوں دار اونچی دیوار کی ٹوپی پہنتے تھے۔پان کھانے کا شوق تھا۔زندگی باسلیقہ اور صاف ستھری تھی۔اصغر کا پسندیدہ مشغلہ کتب بینی تھا۔فرصت کا تمام وقت مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔اصغر نے ریلوے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد چوک بازار گونڈہ میں ایک بساط خانے کی دوکان کھولی۔اس دوکان پر دوستوں کی محفل جمتی،قدیم وجدید شعراء کے کلام اور ان کے شعر وسخن پر بحث ہوتی۔جگر سے اصغر کی ملاقات مشاعروں میں ہوئی تھی۔رفتہ رفتہ یہ دوستی پروان چڑھتی گی اور اصغر نے اپنی سالی نصیر کا نکاح جگر سے پڑھا دیا۔اصغر اور جگر دونوں نے مل کر چشموں کا کاروبار شروع کیا۔کچھ عرصے بعد یہ کاروبار بند ہوگیا۔اصغر ہندوستان اکیڈمی الہ آباد سے وابستہ ہوئے تو الہ آباد میں رہنے لگے اور مرتے دم تک الہ آباد میں ہی رہے۔اصغر ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔20 نومبر 1936ء کو ان پر فالج کا حملہ ہوا۔29 نومبر 1936ء کو ماہ رمضان کے دوسرے عشرے میں انتقال کر گئے۔اور حضرت شیخ عبداللہ الہ آبادی کے احاطہ مزار میں آسودہ خاک ہوئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اصغر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ اصغر کی پہلی ملازمت کون سی تھی؟

4.5 اصغر گونڈوی کی ادبی خدمات

اصغر نے بہت کم لکھا ہے، لیکن انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ انتخاب ہے۔ اصغر زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے۔ مگر اپنے ذاتی مطالعے سے انہوں نے قابلیت کے جوہر پیدا کر لیے تھے۔ اصغر کا پسندیدہ مشغلہ کتب بینی تھا۔ فرصت کا تمام وقت وہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ 1912ء میں قاضی محمد حامد حسرت نے فیض آباد سے 'قیصر ہند' نامی ہفتہ وار رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے کی ترتیب وتدوین کا کام اصغر نے انجام دیا۔ اس کے اداریے لکھے۔ اصغر کے اداریے نہایت متوازن، حقیقت پسند اور بصیرت افروز ہوتے۔ اصغر کا ابتدائی کلام اسی رسالے میں شائع ہوتا تھا۔ 1926ء سے 1928ء تک اصغر لاہور کے ادارۂ اردو کتب کی تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے ۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں اصغر اقبال سے فیض حاصل کرتے رہے۔ 1930ء میں اصغر ہندوستان اکیڈمی الہ آباد سے وابستہ ہوئے اور تادم آخر اس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ہندوستان اکیڈمی کی ملازمت کے دوران اصغر نے ''اردو شاعری کی ذہنی تاریخ'' لکھی۔ لیکن یہ شائع نہ ہو سکی۔ یہیں پر انھوں نے بچوں کے لیے درسی کتابیں تیار کیں۔ اصغر نے مرثیوں پر بھی لکھا جو اردو مرکز لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ مگر اب یہ سب ناپید ہیں۔ نشاط روح، سرور زندگی، ان کے دو مشہور شعری مجموعے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ 'قیصر ہند' نامی رسالہ کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

۲۔ لاہور میں اصغر کس ادارے سے وابستہ تھے؟

۳۔ لاہور میں اصغر کس مشہور شاعر سے ملے؟

4.6 اصغر گونڈوی کی غزل گوئی

اصغر اپنی منفرد غزل گوئی کے سبب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے معاصر حسرت،جگر،فانی،یگانہ کسی نہ کسی سیاسی پارٹی یا ادبی تحریک کا اثر قبول کر رہے تھے۔مگر اصغر نے کسی سیاسی پارٹی یا کسی ادبی تحریک کا اثر قبول نہیں کیا۔اس دور میں مسلم لیگ اور کانگریس وغیرہ سیاسی جماعتوں کا زور بڑھ رہا تھا۔اس دور کے شعرا ان سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کا اثر قبول کر رہے تھے۔مگر اصغر واحد ایسے شاعر تھے جنھوں نے ان حالات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔گاندھی ازم کا بھی زور تھا۔اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد روس میں انقلاب آچکا تھا۔جس کا اثر ساری دنیا میں پھیل چکا تھا۔ہندوستان میں بھی قومی جذبات اور آزادی کی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔جس سے نہ صرف پڑھا لکھا طبقہ بلکہ عوام میں بھی بیداری کا جوش پیدا ہو چکا تھا۔نوجوان نسل میں اشترا کی نظریات جڑ پکڑ رہے تھے۔ہندوستان کی ذہنی،سیاسی،سماجی،معاشرتی تبدیلیوں کا اردو ادب اور اردو شاعری پر گہرا اثر پڑ رہا تھا۔لیکن اصغر کو ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔اصغر نے اپنی شاعری میں کبھی نالہ فریاد،آہ و بکا نہیں کی۔ان کے کلام میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے،جذبے میں شدت اور بے چینی نہیں ہے۔شاعری میں انہوں نے کسی کے آگے زانوے ادب تہہ نہیں کیا۔ابتداء میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسنیم کو دکھائیں۔اصغر کی غزلوں میں پاکیزہ اور بلند اخلاقی قدروں کی تلقین ہے۔اصغر نے عشق ومحبت،حسن وادا،ہجر ووصال،سوز وگداز،جوش ووارفتگی اور حسرت ویاس وغیرہ ہر قسم کے جذبات کو غزل میں پیش کیا ہے مگر ان کے یہاں سوقیانہ پن،عامیانہ انداز،بے موقع شوخی اور ابتذال کی جھلک نہیں ملتی۔

اصغر کی شاعری میں صوفیانہ اور فلسفیانہ انداز نظر آتا ہے۔اور ان کا یہ وصف ان کی ہر غزل میں پایا جاتا ہے۔صرف چند اشعار سے قطع نظر ان کا لگ بھگ سارا شعری سرمایہ غماز ہے کہ اصغر صوفی شعرا کی طرح افسردگی،مایوسی،دنیا کی بے ثباتی اور ترک دنیا کے مضامین نہیں ملتے۔ان کے پاس رقص وسرور وسرمستی کی کیفیت ملتی ہے۔اصغر کے یہاں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جس میں انھوں نے اپنے محبوب حقیقی کو مختلف جگہوں پر مختلف طرح سے آواز دی ہے،سراہا ہے اور اس کے حسن کو اپنے اشعار میں سنوارا ہے۔

کس درجہ ترا حسن بھی آشوبِ جہاں ہے
جس ذرہ کو دیکھتا وہ تڑپتا نظر آیا

اصغر کے یہاں چند اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق مجازی کا مزہ بھی چکھا ہے اور اس کے اثرات آج بھی ان کے ذہن پر ہیں۔

اب وہی چشم فسوں کار مجھے بھول گئی
کس محنت سے کیا تھا تہہ و بالا مجھ کو

شعرا کا یہ مذاق عام ہے کہ وہ ہمیشہ معشوق کو جفا پیشہ، کینہ پرور، ظالم، سنگدل اور بے مروت وغیرہ قرار دیتے ہیں۔اور اس کے ظلم اور بے اعتنائی پر شور مچاتے ہیں۔درد وغم کے آنسو بہاتے ہیں۔مگر اصغر ایسے حالات میں شور مچانے کے بجائے دل پر لگی چوٹ سہہ جاتے ہیں۔ان کا دل روتا ہے،لیکن بظاہر خاموش،لب ساکت،آنکھیں پرسکون، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔یہاں اصغر کا تصور محبت کچھ اور ہے وہ اپنے محبوب کو چاہتے ہیں۔اور سو جان سے چاہتے ہیں۔وہ محبوب کے ظاہری حسن کے نہیں بلکہ اس کے باطنی حسن کے پجاری ہیں۔ان کا محبوب شاہد حقیقی ہے۔جس کا کوئی جسم نہیں۔ اصغر اپنے محبوب کے دستِ نازک،لغزش پا، رخ رنگین اور عارض پرنور کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے الجھ کر رہ جاتے ہیں۔یہاں اصغر کی شعری ہنرمندی نظر آتی ہے۔وہ اپنے محبوب کے حسن و جمال کے بیان کے لیے مختلف اشارات اور علامات سے کام لیتے ہیں۔اشارے،علامات،تشبیہات، استعارات،تلمیحات وغیرہ فن پارے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔جس سے بات آسانی سے قاری کے ذہن نشین ہوتی ہے۔اور شعر پڑھنے کے دوران ہی اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔اصغر کے کلام میں بھی ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں،جن میں انہوں نے نادر تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ان کے استعمال سے اصغر نے اپنے کلام کو پر تکلف آلہ اظہار بنا دیا۔

سب سمجھتے ہیں اسے شمع شبستانِ حرا
نورِ یے کونین کا لیکن جمالِ مصطفےٰ

اصغر کے کلام کی بڑی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے غیر مرئی اشیاء کو مرئی حیثیت سے پیش کیا ہے۔کہتے ہیں:

تمتما اٹھے وہ عارض میری عرض ،شوق پر
حسن جاگ اٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

اصغر کے اشعار میں خیالات کی ندرت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جن کیفیات سے اصغر متاثر ہوتے ہیں، انہیں ہو بہو مخاطب یا پڑھنے والے منتقل کر دیتے ہیں۔اس سے سننے اور پڑھنے والے پر بھی وہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔جس سے اصغر دو چار ہوتے ہیں۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ حسن کی بجلی عشق پر گرتی مگر اصغر کے اشعار پڑھنے سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی عشق حسن پر حاوی ہے،جس کی بدولت حسن پر ایک نشہ سا چھایا ہوا ہے اور حسن خود عشق کی ایک نظر کرم کے لیے بے چین و بے تاب ہے۔

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی
لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تمنا سے

اصغر کی شاعری بالکل نئی قسم اور پاکیزہ جذبات کی عکاسی ہے۔ اصغر کے پاس عشق، محبوب کے حسن کا نظارہ کر کے اس سے لطف اٹھانے کا نام ہے۔ انہوں نے شاعری میں جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ اس کی مثال اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اصغر کی انفرادیت یہ کہ وہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ٹکرا کر غنائی جھنکار پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے ہر شعر سے ایک راگ اور ہر غزل سے ایک سر نکلتا محسوس ہوتا ہے اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی قریب بیٹھا سروں میں گنگنا رہا ہو۔

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کر دئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے چشمِ یار ہوا

4.6.1 اصغر کے منتخب غزلوں کی تشریح

غزل (ا)

مستی میں فروغ ِرخ جاناں نہیں دیکھا
سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا

اس شعر میں شاعر نے دل و دماغ کی خاص کیفیت بیان کی ہے، جہاں عشق کی وجہ سے عاشق پر ایسا سرور اور ایسی مستی چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کی ساری چیزیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ محبوب بھی۔ محبوب سے ملنے کی خواہش ایسی ہے کہ وہ سامنے آیا تو اس سے بات کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ عشق کا جذبہ شدید ہو گیا۔ عشق ہی عشق کی منزل مقصود ہے۔ محبوب کے آنے سے عاشق پر کیف و سرور کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ گلستان میں بہار آئی ہے۔ رونقیں بڑھی ہیں۔ محبوب آنے کی خوشی ایسی تھی کہ گلستان کا نظارہ بھی کر نہ سکا۔ یہاں عاشق کا جذبہ عشق منزل بن گیا ہے۔ حسن بھی اس کی منزل نہیں ہے۔

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تیری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

اس شعر میں شاعر نے حسن کی تعریف کی ہے۔وہ کہتا ہے کہ عشق کی وجہ سے آدمی ناکارہ ہوجاتا ہے، مذہب سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔زاہد نے میرے محبوب کو دیکھا نہیں ہے اگر میرے محبوب کو وہ دیکھ لے تو اسے پتہ چلے گا کہ حسن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔وہ اگر میرے محبوب کی زلفوں کو اس کے رخ پر دیکھ لے تو اس کا ایمان بھی چلا جائے۔

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

شاعر کہتا کہ میرے آگے حسن اور اس کے جلوے، نظارے بہت آئے۔مگر تجھ سے ملنے کے بعد ان سب سے میں قطع تعلق ہوگیا۔میری آنکھوں میں صرف محبوب کا چہرہ رہ گیا۔نیک اور زاہد دنیاوی چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ان کے دل ہمیشہ محبوب کی یادیں ہوتے ہیں۔حیرانگی عشق کی علامت ہے۔شعر کو ہم عشق حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں معنوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب
فتنوں نے ترا گوشہ داماں نہیں دیکھا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی فسادات ہیں، فتنے ہیں، جن سے دنیا پریشان ہے۔ان سب سے بڑھ کر ہزاروں فتنے محبوب کے دامن کے گوشے میں ہیں۔دنیا کا کوئی فتنہ اگر محبوب کے فتنوں کو دیکھے گا تو سمجھ جائے گا کہ ان فتنوں کے آگے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔سارے فتنے، سارے مصائب اور ساری پریشانیاں محبوب کے ہجر، جدائی عشق کی پریشانیوں سے کم ہی ہیں۔

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا

عام طور پر عاشق شبِ ہجراں کی شکایت کرتے ہیں کہ محبوب کے بغیر رات نہیں کٹتی۔فارسی اور اردو شاعری میں شب فرقت کا بیان بہت زیادہ ملتا ہے۔عشق میں شاعر بڑی پریشانی سے رات گذارتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ شب ہجراں

میں بھی تیری صورت میری نظروں میں رہتی ہے۔میں ہر وقت تیرے ہی خیالوں میں رہتا ہوں۔اس لیے مجھے تکلیف نہیں ہوتی۔یہاں اس شعر میں اصغر نے نئی بات پیدا کی ہے جب کہ عام طور شاعر شبِ فرقت کی بات کرتا ہے۔

کچھ دعوی تسکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ زاہد جو بڑی سنجیدگی سے صبر وتحمل سے دعویٰ کرر ہا ہے کہ میں تو بہکا ہوا نہیں ہوں عقل و ہوش میں ہوں۔لیکن خود اسے پتہ نہیں ہے کہ اس نے اپنا گریباں چاک کرر کھا ہے۔۔وہ بے قرار ہو کر بھول گیا ہے اور دعویٰ کرر ہا ہے کہ ہم ایسے نہیں ہیں۔

رودادِ چمن سنتا ہو اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

قفس اور چمن اردو شاعری کے استعارے ہیں۔شاعر عشق کے الزام میں قفس میں ہے۔وہ چمن سے دور ہو گیا ہے اور قفس میں آنے والوں سے گلستاں کا حال پوچھتا ہے۔اس کی بے چینی اور اس کی بیقراری ایسی ہے جیسے کبھی اس نے گلستاں کو اور اس کی بہار کو دیکھا ہی نہ ہو۔

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

عشق میں عاشق کو کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔وہ کیا کہہ رہا ہے کہ کیا کرر ہا ہے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا۔یہاں تک کہ عاشق جب دیوانگی کے دور سے گزرتا ہے تو اپنے گریباں کو چاک کر لیتا ہے۔دیوانگی جب ختم ہو جاتی ہے تو دیکھتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں کپڑے تار تار ہو گئے ہیں۔عشق میں ، بے خودی میں عاشق کو خود کا بھی ہوش نہ رہا۔

شائستہ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

اصغر کہتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملا کہ جس کی صحبت میں رہا جائے۔چاہے کافر ہو یا مسلماں، اس کا کردار اور

سیرت اچھی ہونی چاہیئے۔اسے دیکھنے اوراس سے ملنے کے بعدخواہش ہو کہ اسے دوست بنایا جائے۔اس کی صحبت میں رہا جائے۔لیکن ایسا شخص اس دنیا میں نہیں ہے نظر آتا۔ بلکہ اس دنیا میں تو برائیاں عام ہیں۔ چاہے برائیاں کافروں میں ہوں یا مسلمانوں میں۔

☆

غزل (۲)

پاتا نہیں جو لذت آہ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

سحر کے وقت جو آہ کی جاتی ہے اس کی لذت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔آہ سے مراد عبادت، ذکر، مراقبہ وغیرہ کے ہیں جو رات کے پچھلے پہر میں کیے جاتے ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ آہ سحر گاہی سے مجھے دولت، شہرت جیسی دنیاوی وضمنی چیزیں تو نصیب ہوگیں۔مگر جو مجھے چاہیے وہ مجھے نصیب نہیں ہور ہا ہے تو پھر میں ایسے اثر کو لے کر کیا کروں۔شاعر کو دنیاوی چیزیں حاصل ہورہی ہیں آخرت کی نہیں اس شعر میں اللہ کے سچے بندوں کی کیفیت بیاں کی گئی۔

آشوب گاہِ حشر مجھے کیوں عجیب ہو
جب آج دیکھتا ہوں تری رہ گزر کو میں

شاعر کہہ رہا ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو ہر طرف مصیبت، فتنہ، فساد، برپا ہوگا۔ ہر شخص پریشانی کے عالم میں ہوگا۔قیامت کی یہ نشانیاں میرے نزدیک نئی نہیں ہیں، کیوں کہ میرا محبوب جب راہ سے گذرتا ہے تب مجھ پر قیامت ہی تو گذرتی ہے۔اس شعر میں شاعر محبوب کے جلوے کی تعریف کر رہا ہے۔

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی تعریف کر رہا ہے۔وہ اپنے محبوب کے چہرے کو تکتے ہی جا رہا ہے اس کی نظر محبوب کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں ہے۔اسے محبوب کے حسن میں خدا کی صناعی نظر آرہی ہے۔مخلوق کے اندر وہ خالق کو دیکھ رہا ہے۔اسے لگتا ہے کہ ایسی دلکشی اور جاذبیت تو زمینی مخلوق میں نہیں ہوسکتی یہ تو کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی ہے۔

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

شاعر کہہ رہا ہے کہ میں اپنے محبوب کے مزاج سے اس حد تک واقف ہو گیا ہوں کہ اس کی ہر ہر ادا کو پہچاننے لگا ہوں۔اس کی ہر منشا کو جاننے لگا ہوں۔وہ کسی بات پر خوش ہوتا ہے۔اور کس بات پر ناراض ہوتا ہے۔یہ میں اب خوب جان گیا ہوں۔

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے
ان کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی اداؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ محبوب کچھ اس ادا سے، کچھ اس انداز ہ سے جلوہ دکھا کر چل دیا کہ میں عقل سے بیگانہ ہو گیا۔مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔اس دیوانگی میں اپنی خبر لوں یا محبوب کی خبر لوں یہ مجھے معلوم نہیں معلوم۔

آہوں نے میری خرمن ہستی جلا دیا
کیا منہ دکھاؤں گا تری برق نظر کو میں

خرمن ہستی سے مراد زندگی کا کھلیان یعنی انسان کا اپنا وجود۔آسمان ہمیشہ باغبان کا اور باغ کا دشمن ہوتا ہے۔بجلی گرتی ہے اور کھیت کھلیان کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے، اسے جلا دیتی ہے۔شاعر کہہ رہا، میری آہوں میں اتنی گرمی تھی کہ اس نے میری ہستی کو جلا دیا۔آہوں کی گرمی کی شدت سے میری ہستی ختم ہوگئی اور جب محبوب نے دیکھا کہ میرا وجود ختم ہو گیا ہے تو اسے بڑی مایوس ہوئی۔اپنے محبوب کو مایوس دیکھ کر مجھے شرمندگی سی ہوئی کہ وہ اپنی سرد مہری کو دکھانا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ اس کے آنے سے پہلے ہی میرا وجود ختم ہو گیا۔

باقی نہیں جو لذت بیداری فنا
پھر کیا کروں گا زندگی بے اثر کو میں

شاعر کہہ رہا ہے کہ اصل زندگی تو وہ زندگی ہے جہاں انسان، خدا کی ذات کے لیے، اپنے محبوب کی ذات کے لیے

خود کو فنا کر دیے۔اپنے وجود کو مٹانے میں لذت ہے وہ کسی چیز میں نہیں ہے۔یہی اصل زندگی ہے۔ورنہ زندگی بے کار ہے۔

اصغر مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

تجاہل عارفانہ کا یہ شعر ہے۔جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے شاعر کہہ رہا ہے کہ مجھے کوئی جنون نہیں ہے۔لیکن حال یہ ہے کہ درو دیوار کو دیکھ کر گھبرا رہا ہوں۔مجھے ڈر ہے کہ میری اس حرکت سے کہیں مجھے جنوں نہ ہو جائے۔

4.7 خلاصہ

اصغر گونڈوی کا شمار جدید غزل گوشعراء میں ہوتا ہے۔اصغر گورکھپور میں پیدا ہوئے۔لیکن والد کی ملازمت گونڈہ میں ہونے کی وجہ سے ابتدائی تعلیم گونڈہ میں حاصل کی۔اور عمر کا بڑا حصہ گونڈہ میں گذرا۔اسی نسبت سے گونڈوی کہلائے۔ اصغر گونڈوی نے ابتداء میں ریلوے کی ملازمت اختیار کی۔مگر ماحول اور صحبت رندانہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی اس ملازمت کو خیر آباد کہہ دیا۔اور کاروبار کرنے لگے۔چند دن۔''قیصر ہند'' رسالے کی ادارت کی۔لاہور بھی گئے اور آخر میں ہندوستان اکیڈمی الہٰ باد سے وابستہ ہو گئے اور آخر دم تک رہے۔اصغر کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی ،سماجی ،معاشرتی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔اصغر کے معاصر جگر،حسرت،فانی،یگانہ ان حالات کا اثر قبول کر رہے تھے۔مگر اصغر کی شاعری ان سب سے بے نیازی رہی۔ان کی شاعری میں آہ وفریاد نہیں ہے بلکہ سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔اصغر کے اشعار ،فلسفہ اور تصوف کی درخشاں تصویریں ہیں۔ساتھ ساتھ حکیمانہ خیالات اور وسیع النظری کی دلیل ہیں۔اصغر کے اشعار میں لفظوں کی نشست ایسی ہوتی ہے جیسے انیوں نے ان میں نگینے جڑے ہوں۔اصغر کی غزلوں میں سادگی پسندی،شیرنی بیانی،بالغ النظری،لطافت،موسقیت ،تصوف کی آمیزش پائی جاتی ہے۔اصغر کی شاعری کٹر مذہبی نہ تھی بلکہ ان کے کلام میں کٹر پن کی غیر ضروری سختی اور ان کی خودنمائی اور رسوم پرستی سے بغاوت نظر آتی ہے۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱) اصغر گونڈوی کے دور کے سیاسی وسماجی حالات پر روشنی ڈالیے۔

۲) جدید غزل کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ بیان کیجئے۔

۳) اصغر گونڈوی کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱) اصغر گونڈوی کے حالاتِ زندگی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

۲) اصغر گونڈوی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔

۳) اصغر گونڈوی کی کسی ایک غزل کی تشریح کیجیے۔

(ج) درج ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

۱) دشوارِ انکار سے طالب نہیں ڈرتے
یوں سہل تو اقرار ہوا بھی نہیں جاتا

۲) پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا

۳) دُنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منھ پھیر کر گزر جا

۴) اللہ رے ان کے جلوے کی حیرت فزائیاں!
یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے

4.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
نکات	نکتہ کی جمع، باریکیاں
نم	گیلا پن، تری
رقت	رونا، گریہ، رحم دلی
متانت	سنجیدگی، مضبوطی
متقدمین	اگلے زمانے کی، سابقین
تلقین	تعلیم وتربیت، سکھلانا

سوقیانہ پن	بازاری پن
درخشاں	تاباں، روشن
دستِ نازک	نازک ہاتھ
لغزش پا	پاؤں کا لڑکھڑانا
عارض	گال، رخ، عرض کرنے والا
ندرت	عمدگی، انوکھاپن، نادرپن
لیاقت	قابلیت، وصف
ایما	اشارہ
ملازمت	خدمت، نوکری
کشیدہِ قامت	لمبے قد والا، درازقد
تلمیحات	تلمیح کی جمع، نظم یا نثر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن سے کسی قصے کی طرف اشارہ ہو۔
غنائی	نغمہ
تحریکیں	تحریک کی جمع، حرکت کرنا، متحرک کرنا
بالغ النظری	سمجھداری
تصوف	علم معرفت دل سے خواہشوں کو دور کرکے خدا کی طرف دھیان لگانا۔

4.10 معاون کتابیں

۱) کلیاتِ اصغر۔ اصغر گونڈوی۔ کتابی دنیا۔ دہلی

۲) اصغر گونڈوی (انتخاب کلامِ اصغر گونڈوی۔ انجمنِ ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

۳) اصغر گونڈوی، شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر زبیدہ خاتون، کرنول

۴) کلیاتِ اصغر گونڈوی۔ مرتبہ، ساجد صدیقی لکھنوی، لکھنو

☆☆☆

نصاب

(حصہ دوم)

(۱) فانی بدایونی

۱۔ یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

۲۔ ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شب گیر کا

۳۔ خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا

۴۔ ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا

۵۔ ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا

۶۔ وعدے کے یہ تیور ہیں کہ دوں کہ یقیں آیا

۷۔ گلِ خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

۸۔ ادائیں آ گئیں کوئے بتاں کی

۹۔ آیا ہوں حشر میں دلِ شیدا لیے ہوئے

۱۰۔ ہم، موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے

کتابیات:

کلیات فانی بدایونی

(۲) اصغر گونڈوی

۱۔ پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا

۲۔ مستی میں فروغِ رخِ جاناں نہیں دیکھا

۳۔ شعورِ غم نہ ہو فکرِ مآلِ کار نہ ہو

۴۔ ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی

۵۔ گم کر دیا ہے دید نے یوں سَر بسر مجھے

۶۔ پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں

۷۔ صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں

۸۔ یہ عشق نے دیکھا ہے عقل سے پنہاں ہے

۹۔ جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے

۱۰۔ آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لیے ہوئے

کتابیات:

کلیات اصغر گونڈوی

فانی بدایونی

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اُس بزم میں ہُشیار ہوا بھی نہیں جاتا

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے
یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

دشوارِی انکار سے طالب نہیں ڈرتے
یوں سہل تو اقرار ہوا بھی نہیں جاتا

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا

جاتے ہوئے کھاتے ہو میری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دور
کیا خاکِ رہِ یار ہوا بھی نہیں جاتا

دیکھا نہ گیا اس سے تڑپتے ہوئے دل کو
ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا

یہ طرفہ ستم ہے ستم بھی ہے کرم بھی
اب خوگر آزاد ہوا بھی نہیں جاتا

☆☆☆

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شب گیر کا
چونک اٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یا رب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منھ تکتی رہیں تقدیر کا

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہِ خلش
یاد ہے گم ہوگیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

عشق کا بھی کیا تصرف ہے کہ دل اب دل نہیں
آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

آپ کی آزردگی ٔ بے سبب بھی خوب ہے
کیا مزے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اُٹھا ہر ذرہ میری خاکِ دامن گیر کا

برق کو اب کیا غرض کیا جل گیا کیا رہ گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم کو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

نامرادی حد سے گزری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

☆☆☆

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا　　ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا
حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری　　ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا
کعبہ کو دل کی زیارت کے لیے جاتا ہوں　　آستانہ ہے حرم میرے صنم خانے کا
مختصر قصہ ٔغم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں　　رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے　　ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا
تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا
اب اِسے دار پہ لے جاکے سُلا دے ساقی　　یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا
دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں　　سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا
ہڈ یاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں　　لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا
وحدتِ حسن کے جلوؤں کی یہ کثرت اے عشق　　دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا
چشمِ ساقی اثر مے سے نہیں ہے گل رنگ　　دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا
لوح دل کو، غمِ الفت کو قلم کہتے ہیں　　کُن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

☆☆☆

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مرجا

دُنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منھ پھیر کر گزر جا

اُس بحرِ بے کراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

یہ دعوۂ خبر ہی، عصیاں بھی ہے سزا بھی
بے ہوش و بے خبر رہ بے خوف و بے خطر جا

کثرت میں دیکھتا جا تکرارِ حسن وحدت
مجبور یک نظر آ، مختارِ صد نظر جا

یہ میکدہ ہے ، پاسِ آدابِ میکدہ رکھ
اوّل خراب آ، اور آخر خراب تر جا

گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی
اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

☆☆☆

ضبط اپنا شعار تھا ، نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا ، نہ رہا
دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غمگسار تھا، نہ رہا
موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا
اب گریباں کہیں چاک نہیں
شغلِ فصل بہار تھا، نہ رہا

آ کہ وقتِ سکونت مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا ، نہ رہا
ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امیدوار تھا، نہ رہا
آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا، نہ رہا
کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں ساز گار تھا، نہ رہا

مہرباں یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

☆☆☆

وعدے کے یہ تیور ہیں کہہ دوں کہ یقیں آیا
اب اُن سے کوئی کیوں کر کہہ دے کہ نہیں آیا

کافر کی محبت میں ایمان کے لالے تھے
چھُپ چھُپ کے دعاؤں میں وہ دشمنِ دیں آیا

یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے
اک خاک نشیں اٹھا اک خاک نشیں آیا

دنیا کے گلے شکوے ہم حشر میں کیا کرتے
کہنا تو بہت چاہا کچھ یاد نہیں آیا

پھر گورِ گریباں کا ہر ذرہ لرزا اٹھا
فانی کوئی دل شاید پھر زیر زمیں آیا

☆☆☆

گلِ خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسّم ، پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے

کس کو کہیے ما سوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں
تُو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

حد پہ جب پہنچی نظر ، حدِ نظر آگے بڑھی
جو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

نوحۂ تدبیر تھا تقدیر کا اک ایک حرف
خط پیشانی صفِ ماتم نظر آیا مجھے

جو تجھے سمجھا اسے دنیا سمجھ سکتی نہیں
راز تھا جو ، راز کا محرم نظر آیا مجھے

زخم کے مرہم بھی دیکھے ، مرہمِ بے زخم بھی
زخمِ دل ہی، زخمِ بے مرہم نظر آیا مجھے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

☆☆☆

ادائیں آگئیں کوئے بتاں کی   زمیں تک ہے رسائی آسماں کی
زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر   تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی
امیدِ مہر ہے ایمان اپنا   قسم ہے اُس دلِ نامہرباں کی
یہ دل ہے یادگارِ ناوکِ ناز   نشانی ہے یہ زخمِ بے نشاں کی
نوید ربط ہے ہر جَور لیکن   کہاں سے لاؤں طاقت امتحاں کی
مری تربت کے سناٹے میں اب تک   صدائیں گونجتی ہیں الاماں کی

حرم میں آ ہی نکلے ہیں تو فانی
یہ کیا کہیے کہ نیت تھی کہاں کی

☆☆☆

آیا ہوں حشر میں دلِ شیدا لیے ہوئے
آشوبِ صد جہانِ تماشا لیے ہوئے
ہنگامِ نزع راہ تری دیکھتا ہوں میں
آنکھوں میں زندگی کا تقاضا لیے ہوئے
دیکھی ہیں ہم نے گورِ غریباں کی آڑ میں
آبادیاں خرابیٔ صحرا لیے ہوئے
دیکھا نہ اہلِ دل نے کسی دن اٹھا کے آنکھ
دنیا گزر گئی غمِ دنیا لیے ہوئے
ہر آئینہ ہے دعوتِ سعی نظر مجھے
ہر سعی اعتبارِ تماشا لیے ہوئے
اٹھنا وہ تیرے در سے کسی نامراد کا
اک آہِ زیرِ لب کا سہارا لیے ہوئے
فانی مری لحد پہ وہ آئے تو کس طرح
کچھ تیوروں میں شکوۂ بے جا لیے ہوئے

☆☆☆

ہم ، موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے
مجبورِ غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے

دل ہی میں نہیں رہتے ، آنکھوں میں بھی رہتے ہو
تم دور بھی رہتے ہو تو دور نہیں ہوتے

پڑتی ہیں ابھی دل پر شرمائی ہوئی نظریں
جو وار کرتے ہیں بھرپور نہیں کرتے

امید کے وعدوں سے جی کچھ تو بہلتا تھا
اب یہ بھی ترے غم کو منظور نہیں ہوتے

ارباب محبت پر ، تم ظلم کے بانی ہو
یہ ، ورنہ محبت کے دستور نہیں ہوتے

کونین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور اُن کا
اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

ہے عشق ترا فانی تشہیر بھی شہرت بھی
رسوائے محبت یوں مشہور نہیں ہوتے

☆☆☆

اصغر گونڈوی

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا

اُٹھے عجب انداز سے وہ جوشِ غضب میں
چڑھتا ہوا اک حُسن کا دریا نظر آیا

کس درجہ ترا حسن بھی آشوبِ جہاں ہے
جس ذرے کو دیکھا وہ تڑپتا نظر آیا

اب خود ترا جلوہ جو دکھا وے وہ دکھا وے
یہ دیدۂ بینا تو تماشا نظر آیا

تھا لطفِ جنون دیدۂ خونابہ فشاں سے
پھولوں سے بھرا دامن صحرا نظر آیا

☆☆☆

مستی میں فروغِ رخِ جاناں نہیں دیکھا　　سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا
زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا　　رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے　　میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب　　فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت　　میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا
کچھ دعویِ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد　　مستی میں تجھے چاکِ گریباں نہیں دیکھا
رودادِ چمن سنتا ہو اس طرح قفس میں　　جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم　　کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغرؔ
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

☆☆☆

شعورِ غم نہ ہو فکرِ مآلِ کار نہ ہو
قیامتیں بھی گزر جائیں، ہوشیار نہ ہو
وہ دستِ ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے
لحد کا پھول چراغِ سرِ مزار نہ ہو
اٹھاؤں پردۂ ہستی جو ہو جہاں نہ خراب
سناؤں رازِ حقیقت جو خوف دار نہ ہو
ہر اک جگہ تری برق نگاہ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو
یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو
کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
خزاں میں بلبلِ بے کس کو ڈھونڈھیے چل کر
وہ برگِ خشک کہیں زیرِ شاخسار نہ ہو
سمجھ میں برقِ سرِطور کس طرح آئے
جو موج بادہ میں ہیجان و انتشار نہ ہو
دکھادے بے خودیِ شوق وہ سماں مجھ کو
کہ صبح وصل نہ ہو شام انتظار نہ ہو
نگاہِ شوق کو یارائے سیر و دید کہاں ؟
جو ساتھ ساتھ تجلّیِ حسنِ یار نہ ہو
ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی ؟
غبارِ قیس کہاں خود ہی پردہ دار نہ ہو

☆☆☆

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذاللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

☆☆☆

گم کردیا ہے دید نے یوں سَر بسر مجھے
ملتی ہے اب انھیں سے کچھ اپنی خبر مجھے

نالوں سے میں نے آگ لگادی جہان میں
صیاد جانتا تھا فقط مشتِ پر مجھے

اللہ رے ان کے جلوے کی حیرت فزائیاں!
یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے

مانا حریمِ ناز کا پایہ بلند ہے
لے جائے گا اچھال کر دردِ جگر مجھے

ایسا کہ بت کدے کا جسے راز ہو سپرد
اہلِ حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیسا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

مست شباب وہ ہیں، میں سر شارِ عشق ہوں
میری خبر انھیں ہے نہ ان کی خبر مجھے

جب اصل اِس مجاز و حقیقت کی ایک ہے
پھر کیوں پھرا رہے ہیں ادھر سے اُدھر مجھے

☆☆☆

پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

آشوب گاہِ حشر مجھے کیوں عجیب ہو
جب آج دیکھتا ہو تری رہ گزر کو میں

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اُس میں چھپا ہوا
اُس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظرکو میں

جینا بھی آگیا مجھے مرنا بھی آگیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے
اُن کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلادیا
کیا منہ دکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں

باقی نہیں جو لذت بیداریِ فنا
پھر کیا کروں گا زندگی بے اثر کو میں

اصغرؔ مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کر دیوار و در کو میں

☆☆☆

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

مجھ میں نوائے عیش کی رنگینیاں نہیں
سوزِ خموشِ عشق ہوں سازِ بیاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں

وہ بہترین دورِ محبت گزر گیا
اب مبتلائے کشمکش امتحاں نہیں

اب ہوتو سنگ وخشت سے سرکوسکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں

کسبِ حیاتِ نو تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں

سارا حصول ،عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِعشق و محبت اُنھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اِسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دیکھوں ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اُس کا امتحاں ہے مرا امتحاں نہیں

اب اُس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبت روحانیاں نہیں

☆☆☆

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرے میں سمندر ہے ذرے میں بیاباں ہے

ہے عشق کہ محشر میں یوں مست و خراماں ہے
دوزخ بہ گریباں ہے فردوسِ بہ داماں ہے

ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زیبائی
جو خون اُچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے

پھر گرمِ نوازش ہے ، ضو مہرِ درخشاں کی
پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے دیکھوں
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

سوبار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا ، اپنا ہی گریباں ہے

اک شورشِ بے حاصل ، اک آتش بے پروا
آفت کدۂ دل میں اب کفر نہ ایماں ہے

دھوکا ہے یہ نظروں کا ، بازیچہ ہے لذت کا
جو کنج قفس میں تھا وہ اصل گلستاں ہے

اک غنچۂ افسردہ ، یہ دل کی حقیقت تھی
یہ موج زنی خوں کی رنگینیٔ پیکاں ہے

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے
اُس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

اصغر سے ملے لیکن ، اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں ، کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

☆☆☆

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

نیرنگِ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے
آنکھوں سے اگر دیکھو پردا نظر آتا ہے

لَو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اے پردہ نشیں ضد ہے کیا چشم تمنا کو
تُو دفترِ گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے

نظارہ بھی گم ہے بیخود ہے تماشائی
اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے

جو کچھ تھی یہاں رونق سب بادِ چمن سے تھی
اب کنجِ قفس مجھ کو سونا نظر آتا ہے

احساس میں پیدا ہے پھر رنگِ گلستانی
پھر داغ کوئی دل میں تازہ نظر آتا ہے

تھی فردِ عمل اصغرؔ کیا دستِ مشیت میں
اک ایک ورق اس کا سادا نظر آتا ہے

☆☆☆

آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لیے ہوئے
جنت میں بھی ہوں جنتِ دنیا لیے ہوئے

پاسِ ادب میں جوشِ تمنا لیے ہوئے
میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لیے ہوئے

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار
صد ہا حجاب صورت و مثنی لیے ہوئے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازیِ قدر عنا لیے ہوئے

طوفانِ ناز اور پریشاں غبارِ قیس
شانِ نیاز محمل لیلیٰ لیے ہوئے

پھر دل میں التفات ہوا، ان کے جاگزیں
اک طرز خاص رنجش بے جا لیے ہوئے

پھر اُن لبوں پہ موجِ تبسم ہوئی عیاں
سامانِ جوشِ رقصِ تمنا لیے ہوئے

صوفی کو ہے مشاہدۂ حق کا ادّعا
صدہا حجابِ دیدۂ بینا لیے ہوئے

صدہا تو لطفِ مے سے محروم رہ گئے
یہ امتیازِ ساغر ومینا لیے ہوئے

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلش ہائے روز گار
دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لیے ہوئے

تُو برقِ حسن اور تجلّی ہے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

اُفتادگانِ عشق نے سر، اب تو رکھ دیا
اٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لیے ہوئے

رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جز خیالِ دوست
اُس شوخ کو ہوں آج سراپا لیے ہوئے

دل مبتلا و مائل تمکین اِتقا !
جامِ شرابِ نرگسِ رسوا لیے ہوئے

سرمایۂ حیات ہے حرمانِ عاشقی
ہے ساتھ ایک صورتِ زیبا لیے ہوئے

جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار
روتے ہیں منہ پہ دامنِ صحرا لیے ہوئے

اصغرؔ ہجومِ درد غریبی میں اُس کی یاد
آئی ہے اک طلسمِ تمنا لیے ہوئے

☆☆☆